بہترین ہسپانوی افسانے

ترجمہ : رحیم

زندہ کتابیں

پسین کی داستان خیز سرزمین میں آج تک جو بہترین افسانے لکھے گئے ہیں، یہ کتاب ان کا نمائندہ مجموعہ ہے

2.50

مکتبۂ جدید

بہترین ہسپانوی افسانے

بہترین

ہسپانوی افسانے

ترجمہ و انتخاب

رحیم

مکتبۂ جدید، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار ——— زندہ کتابیں ——— ۱۹۶۴ء
طابع وناشر : رشید احمد چودھری
مکتبۂ جدید پریس، لاہور

یعقوب کے نام ——

جس کے پیہم اصرار و معاونت کے طفیل میں ان
افسانوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے قابل
ہو سکا ——

رحیم

ترتیب

پیش لفظ		۷
گھر کی عزّت	کارلوس وائلداوسس پینا	۱۵
میری بہن انتونیا	رامون ویل والئے انکلان	۲۵
خون کی کشش	میگوئل دے سیروانتیس	۴۷
بحری نمک	بین خامین سوبیر کاسو	۷۵
خاکِ باد	ایزناندوتیلیٹ	۱۱۷
عقیدت کی جیت	رکاردوگیرالدیس	۱۲۵
سسٹر ایپاری سی یوں	ایمیلیا پاردوباشان	۱۳۲
خاکِ زرخیز	پیو باروخا	۱۴۱
پیش گوئی	پیدرو انتونیو دے الارکون	۱۴۹
بھیڑیا ۱۳	آیتورو آلابارسے	۱۶۳
صاحبِ کردار	رومولو گالیگوس	۱۷۱
دو لڑاکا فاختائیں	رکاردو پالما	۱۸۳

پیش لفظ

آپ کی خدمت میں ہسپانیہ (سپین) کے مختصر افسانوں کا ایک نمائندہ مجموعہ پیش کرنا ہی اس کتاب کا مقصد ہے مختلف ادوار میں ہسپانوی کہانیوں نے جو ادبی رنگ اختیار کیے، ان کے نمونے ہسپانوی اور امریکی ہسپانیہ کی سرزمینوں سے فراہم کیے گئے ہیں۔

سالہا سال کی مدتِ مدید میں ہسپانوی مختصر افسانے نے کئی شکلیں بدلیں۔ لوک کہانیاں ابتدا سمجھیے اور مصنّف کی تحلیلِ نفسی اور ذاتی نکتہ ہائے نظر کے ترجمان افسانے انتہا، اور اگر ان کی طوالت کی ابتدا چڑیا چڑے کی ننھی کہانی تھی تو انتہا مختصر ناول۔ آپ کو قدیم ترین شکل ان روایتی قصّوں میں ملے گی جو انسان کے جمالیاتی ذوق کا ابتدائی ذریعۂ اظہار ہیں۔

عربی شان و تجمل کے آٹھ سو سالہ تسلط میں سپین مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال تھا اور غرناطہ، قرطبہ اور تولیدو میں عربی تہذیب و تمدّن اپنی صولت و شوکت کی معراج پر پہنچی ہوئی تھی۔ عرب اپنے ساتھ صرف مشرق کا فلسفہ اور سائنس ہی نہیں لائے تھے جو قرونِ وسطیٰ میں یہاں سے یورپ بھر کو نصیب ہوئی بلکہ مشرقی افسانوں کے بہت سے مجموعے بھی ہمراہ تھے۔

الفانسو، دانائے سپین کا دربار علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ اس نے ۱۲۶۱ء میں ان مجموعوں میں سے ایک کے ترجمے کا حکم دیا ــــ کلیلہ و دمنہ۔ دو سال بعد ایک

اور ترجمہ بحکم برادرِ شاہ - دون فدریک - معرضِ وجود میں آیا ـــ سندباد کا سفر اور اس کے بعد بے شمار ترجموں نے سپین کے دل و دماغ کو نوازا -

لیکن اصل ہسپانوی نژاد مختصر افسانہ میگویل دے سیروانتیس کے زورِ تخیل کا مرہونِ منت ہے اور اس کی ابتدا اس کی کتاب موسومہ مثالی ناول سے ہوتی ہے جو پہلی بار ۱۶۱۳ء میں چھپی تھی - اس کتاب کے بارہ قصوں اور ان کہانیوں کے ذریعے جو "دون کیخوتے" میں مندرج ہیں اس نے دنیا کو ایک نیا اسلوبِ بیان بخشا - کہانیاں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ایسی ہیں جو ابھی تک معرضِ تحریر میں نہیں آئی تھیں - ان کے موضوعوں میں تنوع ہے اور ان کے رنگا رنگ اسلوبِ اظہار کے فنی جوہروں سے سیروانتیس کو اپنے پیش رو ادب کے اظہارِ بیان پر پوری پوری دسترس ہو گئی - اس نے اپنے سے پہلے افسانہ گوؤں کی تصنیفات سے اپنے مفید مطلب مواد کو کانٹ چھانٹ لیا اور جس زبان کو انھوں نے قطع و تراش سے اک صورت دی تھی اس نے اس میں اپنی روشنیٔ طبع سے شیرینی، لطافت اور لچک بھر دی - آگہیٔ ذات کی بےنظیر صفت سے متصف ہو کر وہ اپنی کتاب "مثالی ناول" کے دیباچے میں یہ کہتے ہوئے حق بجانب نظر آتا ہے کہ "میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس نے ہسپانوی زبان میں کہانیوں کو تخلیق کیا ہے کہ وہ جو ہسپانوی زبان میں متعدد مطبوعہ کہانیاں بازاروں میں دیکھنے میں آتی ہیں - غیر ملکی زبانوں سے ترجمہ ہو رہی ہیں، لیکن یہ کہانیاں میری اپنی چیز ہیں - نقل اور سرقہ کا مال نہیں ہیں - میری قوتِ متخیلہ نے انھیں جان بخشی اور میرے قلم نے انھیں تخلیق کیا -"

ان کہانیوں کا رواج فوراً قبولِ عام کی سند حاصل کرتے ہوئے دور و نزدیک پھیل گیا - ایک ہی سال میں فرانسیسی میں ترجمہ ہوئیں اور اس کے جلد ہی بعد انگریزی اور جرمنی میں - چند میں لوٹ کھسوٹ اور بدمعاشوں کی کرتوتوں کے قصے ہیں - چند سماج پر طنز ہیں - چند میں نفسیاتی مطالعے ہیں - چند عجیب و غریب معرکوں سے بھرپور ہیں اور چند ایسی ہیں جن

میں ان تمام گوناگوں عناصر کو یکجا دکھایا گیا ہے ـــــ اور موخر الذکر ہی اس مجموعے کی زینت ہیں۔ یہ کہانیاں اس مطمحِ نظر کی حامل ہیں جس کی تحصیل کے لیے سپین کا آرٹ کوشاں ہے ـــــ مطمحِ نظر جو اُس بھری پُری اور پوری پوری زندگی کا عکاس ہے جس میں بہبودگیاں ہیں، تناقص ہیں، نقائص ہیں، قباحتیں ہیں، خوبصورتیاں ہیں اور حقیقت و مثالیت کا امتزاج ہے۔

تمام ادوار کے عظیم ہسپانوی ادبا نے ارادتاً یا بہ فیضِ وجدانِ فطری اتنا ضرور محسوس کر لیا تھا کہ عام لوگ ہی ان کے فن کے لیے اک دوامی مواد لیے ہوئے ہیں جس میں رموز و اسرار کا اک دفترِ پنہاں ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہسپانوی ادب میں مافوق العادات اور عجائب و غرائب باتیں شاذ شاذ ہی ملتی ہیں۔

رومانیت نے ادب کی نئی نئی قسموں کو جنم دیا اور دو تو خاص طور پر بڑے زور شور سے ہسپانوی دنیا میں مروج رہیں۔ ایک کا نام ہے Cuadros de costumbreis جو زیادہ تر پُر لطف سین اور واقعات کی تصویر کشی سے متعلق رہی۔ یہ ایک طرح کے خاکے تھے جن میں ماحول اور چال ڈھال اور دوسرے تعلقاتِ انسانی کی جزئیات نگاری پر زور دیا جاتا تھا اور انہی خاکوں نے حقیقت پسندی کے بیج بو دیئے۔ دوسری نوع ادب مقامی تاریخی کہانی پر مشتمل تھی اور نثر و نظم دونوں میں رائج تھی۔ اس نوع کو ۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل میں قبولیت عام حاصل رہی اور یہ تھی بھی ہسپانیہ اور ہسپانوی امریکہ سے مختص۔ چنانچہ اسے یہاں اور جگہوں کی نسبت زیادہ اپنایا گیا۔ مقامیت، انفرادیت کی اک اور قسم ہے اور ہسپانوی کردار کی جان۔ ہر شہر، قصبہ، محلّہ، بازار اپنی اپنی مخصوص کہانیوں کی ترنگ میں مست تھا اور ہر کہیں ہسپانوی ادیب اس سے جی بھر کر بہرہ یاب ہوئے۔ لیکن 'پیرو' کے ریکارڈو پالما کے سر پر اس بات کا سہرا بندھتا ہے کہ اس نے ان دونوں انواع کو مقامیت کی محدود فضا سے نکال کر عالمی فضاؤں کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ "پیرو کی روایات اور حکایات"

کا طویل سلسلہ شاہد ہے کہ اس نے خود اپنے ملک کا ماضی از سرِ نو زندہ ہی نہیں بلکہ تخلیق کر ڈالا ہے۔ جو واقعات اس نے بیان کیے ہیں ان کا محور لیما ہوتا تھا یا کوئی اور پیرو کی شاہانہ تمکنت کا مقام — اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ کل ہی وقوع پذیر ہوا تھا۔ مدت ہائے مدید اور دور دراز کی باتوں کو اس زور سے بیان کرتا ہے کہ ان پر حال کے ہونے کا شبہ گزرتا ہے۔ اس کے بینظیر زورِ تخیل میں اک ندرت، لطافت اور ستم ظریفی فطرت کی جھلک نمایاں ہے۔

حقیقت پسندی کے ظہور سے ہسپانوی ادب کی نسوں میں قوت کی اک جدید لہر دوڑ گئی۔ یہ تحریک دو ادوار میں بٹ سکتی ہے۔ پہلے دور کے مصنفین نے جو ۱۸۷۰ء میں بام رفعت پر تھے۔ زیادہ تر ناول لکھے اور چند نے مختصر کہانیاں بھی پیش کیں "تین کونوں والی ٹوپی" کا مشہور مصنف الارکون اس دور کا بہترین نمائندہ ہے۔ اس نے تاریخی اور حکایاتی اور ہیبت ناک اور پُراسرار افسانے لکھے ہیں۔ جن میں ایڈگر پو کا اثر صاف واضح ہے۔ مگر ۱۸۸۰ء کے بعد دوسرے دور کے ادیبوں کی ہمتوں نے مختصر افسانے کو اور آگے بڑھایا اور اخباروں اور رسالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے مختصر افسانوں کی مانگ کو تیز کرنے میں خاصی امداد دی۔ فطرت پسندی فرانس میں تو پنپ گئی مگر اس طرح سپین میں قدم نہ جما سکی۔ شاعرانہ سے خالی سرد مہرانہ سائنسی جزئیات نگاری سپین کے مزاج کو راس نہیں آسکتی۔ یہ نہ کہئے کہ ہسپانوی کے پاس زندگی کے سنجیدہ اور مظلوم پہلو دیکھنے کے لیے نظر نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یوں ہے کہ وہ اپنی نظر کو اپنے ذاتی تاثرات سے بھی لبریز کرنا چاہتا ہے۔ انسان — ہسپانوی ادباء کی نگاہوں میں اک محض تجریدی شئے یا فیصلہ کن قوتوں کے سامنے بے بس کھلونا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے اک منفرد حیثیت دیتے ہیں۔ اور اس کی کمزوریوں اور شکست کے ساتھ ساتھ اس کی قوت اور ظفر مندی کا بھی اعلان کرتے ہیں۔ جبر نہیں اختیار۔ ہسپانوی عقیدے کا جزو لاینفک ہے اور

انفرادیت کی اک دوسری شکل۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں فطرت پسندی اور حقیقت پسندی کے خلاف سپین گیر ردِعمل کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اک نیا ادب منصۂ شہود پر آگیا۔ ۱۸۹۸ء کے ہسپانوی دورِ ادب پر وہ مصنفین چھا گئے جن کی تصنیفات میں ہمیں ایسی کہانیاں ملتی ہیں جو ہمارے معاصرانہ احساس کو بے حد متاثر کرتی ہیں اور جن کے فن کا معیار ہمیں آج بھی درست و بجا نظر آتا ہے۔ پلاٹ کی دلچسپی کے علاوہ ہمیں ان کی کہانیوں میں اسلوبِ نگارش اور رسائی موضوع سے خاصا لطف حاصل ہوتا ہے اور اس لاثانی احساس کے پرتو کا پتا چلتا ہے جس نے مصنف کے موافقِ مزاج موضوع کو انتخاب کرنے اور اپنانے میں دست گیری کی ہے۔

ہسپانوی ادب کے دوسرے گل ہائے نظر افروز کے لیے ہمیں سمندر پار کر کے امریکہ جانا ہوگا، یہ اک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ ہسپانوی امریکی ادیبوں کے کارہائے نمایاں ہسپانوی ادب کے تاج کے درخشاں ہیرے ہیں۔

دریافت سے پہلے بھی ہسپانوی امریکہ کا اپنا ادب تھا۔ نو آبادکاری کے دور میں جب ہسپانوی امریکہ آئے تو وہ اور ان کی امریکی اولاد اک ایسے ادب کی تخلیق کے باعث ہوئی جس کی اپنی انفرادی شان تھی مگر کہنا ہی پڑے گا کہ اس کے کثیر حصے پر اسپین کا نقشِ دوام ثبت تھا۔ آزادی کے بعد ہسپانوی ادب بہت سے اثرات کی چغلی کھا رہا ہے مگر اُدب کی ساری انواع نے یکساں جواب نہیں دیا۔ شاعری اور سیاسی ادب وافر نہ، وجود میں آئے اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ اگرچہ ناول اور ڈرامے کی اہمیت کو اتنا نہیں سراہا گیا پھر بھی اکا دکا دلچسپ ناول دیکھنے میں آجاتے تھے۔ ناول کے لیے اک مکمل سماجی ڈھانچے کی ضرورت ہے اور وہ ان دنوں مفقود تھا۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر کا ذکر ہے کہ ہسپانوی امریکہ کے مختلف شہروں میں بیک وقت

غیر معمولی طباع و ذہین ادیبوں کی ایسی "جدت پسند" جماعت میدان میں آئی جس نے ادب میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور جدید ناول اور مختصر افسانے کی داغ بیل ڈال دی۔

اپنے ہسپانوی ہمعصروں کی طرح ان کی تصنیفات میں بھی شاعرانہ اور داخلی تحلیلِ نفسی کا رنگ ٹپکتا ہے اور اپنے فروعی اختلافات کے باوجود دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا ــــ "آہ گئی ذات"۔

سو سال ہوئے جو نصیحت سارمی اینتو نے چلی کے ادیبوں کو پیش کی تھی معلوم ہوتا ہے ہسپانوی امریکی ادیبوں نے بھی اسے ہی اپنا ادبی معیار مقرر کر لیا تھا ــــ

"چشمِ بینا وا کرو ــ اپنی آبائی سرزمین پر نگاہ کرو اور دیکھو اپنے بھائی بندوں کو، ان کے رسم و رواج کو، ان کے اداروں کو، اور ان مسائل کو جن سے ملک دوچار ہے۔ پھر پیار بھرے دل کے ساتھ ان کے متعلق لکھو۔ جو تم محسوس کرتے ہو، جو تمھیں پیش آتا ہے اسے معرضِ تحریر میں لاؤ۔ مضمون خوب ہوگا اور طرزِ مضمون میں جھول ہے تو ہو۔ اس میں تمھارے اپنے جذبات کی شمولیت ہوگی اور جو کبھی کبھار تحریر میں کہیں افراط و تفریط سے واسطہ پڑ جائے تو خاطر جمع رکھو کہ وہ بُری یا بھلی جیسی بھی ہوگی، ہوگی تمھاری اپنی چیز۔"

۲۰ ویں صدی کے ادبا اس دنیا کے باسی ہیں اور اس سے پیوستہ۔ بہتیروں نے غیر ممالک میں جا کر قیام کیا اور حقیقت پسندوں کے برعکس نگاہِ سطحیت سے نہیں بلکہ نگاہِ باطن بیں سے دیکھا اور اپنے عالم کو اپنے دل میں موجود پایا۔ اب وہ زندگی کے ٹھوس اور سخت حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر کام میں مصروف ہیں۔ اپنی منفرد شخصیت کی تلاش میں ہیں اور اپنے ملک اور اپنے لوگ اور اپنے رسم و رواج اور اپنے مسائل ہر وقت ان کے سامنے ہیں۔

اس مجموعے کا زیادہ حصہ اپنی ۲۰ ویں صدی کے ادبا کے شاہکاروں کا متحمل ہے۔

اختلافات کے باوجود ان میں ایک مشترک شئے موجود ہے۔ آپ کو ان کی تحریروں میں روایتی ہسپانوی حسن کی شایستہ تکمیل اور لطف و احتظاظ کم ہی ملے گا کہ ان کا پیغام زیادہ بھرپور، زیادہ انسانیت نواز اور ہمہ گیر ہوگیا ہے جس میں عالی ظرف دل کی ہمدردی، فہم و تفہیم اور ذہن و رجحان شامل ہے۔ اب ان کی نگارشات اپنے مقاصد کی تحصیل کی خاطر عمیق انسانیت نواز جذبات اور زندگی سے عشق آمیز انہماک کا تصور پیش کر رہی ہیں اور فرے لوئی والیون کی ہمنوا ہیں جو کہتا ہے۔

"حقیقتاً حسن یہی ہے کہ ہر چیز اپنی فطرت کے مطابق کام کو انجام دے رہی ہو" اور انہی الفاظ میں فنکارانہ دیانت کی تعریف مضمر ہے۔

ہسپانوی مختصر افسانوں کے تدریجی ارتقا کی یہ مجمل سی داستان ہے۔

آٹھ سو سالہ عربی حکومت کے کرداروں کے نقش ان اہلِ ہسپانیہ میں یوں پیوست ہیں کہ اب بھی ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اجداد کے خون کی پکار نہ بھولے ہیں نہ بھلا سکے ہیں۔ وہی غیرت و حمیت، وہی ذہنی سوجھ بوجھ کی تیزی، وہی بہار کی سی لطافت اور خنجر کی سی درشتی اور عربی دورِ آخر کی لاابالیانہ طبیعت اور وہی مبالغہ آرائی اور امارت پسندی۔

ہسپانیہ کی عیسائیت نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے اور جب مسلمان اپنے وطن سے غیروں کی طرح نکالے گئے تو یہی عیسائی کلیسا کا نشانہ بن گئے — فطرت کی سخت ترین تعزیر۔

ان افسانوں میں آپ کو ہسپانیہ اور اہلِ ہسپانیہ کی معاشرتی جھلکیاں، ریب و ریا کے بغیر، صاف صاف نظر آئیں گی۔

رحیم

کارلوس وائلد اوک پینیا

گھر کی عزّت

اس نے سر کو باڑ والے جنگلے کی بلندی سے اونچا اٹھایا اور ہاتھوں کو خمیدہ کر کے ایڑوں پر یوں رکھا کہ مغفر کی سی اوٹ بن جائے اور پھر کمرے کے اندر جھانکنے لگا۔ آدمی نیم اندھا تھا اور بینائی سے زیادہ حواس سے کام لے کر چولھے کی آگ کے شعلوں کو دیکھ رہا تھا جن کی لو کے آگے سے مبہم سائے بازیار آتے جاتے تھے۔ ایک راندۂ قانون کی طبعی حزم و احتیاط کے ساتھ اس نے سر، سننے کے انداز میں اٹھا رکھا تھا اور نتھنوں کو کتے کی طرح، ہوا میں سونگھتے وقت پھیلاتا اور ناک سکیڑتا تھا۔ عورتیں غلے کی روٹیاں پکا رہی تھیں اور اسے ان کے پکانے کی کلپ کلپ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ گرم گرم روٹیوں کی سوندھی بُو ہوا میں تیر رہی تھی اور وہ اس ہوا میں سانس لے رہا تھا۔ ہائے، وہ کتنا بھوکا تھا! اس کی بھوک گداگر کی بھوک سے سخت تھی۔ اس سے بیشتر کہ بھوک کا زہریلا ناگ گداگر کے پیٹ کو چاٹ ڈالے۔ اسے فاقوں سے غش آجائے۔ انسانی ہمدردی اس کی بھوک کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے موجود تھی۔ مگر اس کی بھوک اک مفرور کی بھوک تھی۔ جو شہروں کے نزدیک آکر بھیک مانگنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ جب اُسے روٹی میسر بھی ہو جاتی تھی تو وہ اسے اس حال میں نگلتا تھا کہ خنجر ہاتھ میں ہوتا تھا یا بندوق کندھے پر۔

لیکن جوآن تراَلبس نے دل میں عزم کر لیا تھا۔ کیا وہ گرفت میں آجانے سے خوفزدہ تھا؟ نہیں تو۔ اس سے تو اسے فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس نے معاملے پر خوب سوچ بچار کر لیا

کہ پیٹ کے لیے روٹی اور سر کے لیے چھت سائے کی خاطر اپنے آپ کو پولس کے حوالے کر دینا بہتر رہے گا۔ لیکن فی الوقت وہ مویشی خانے کے باشندوں سے روٹی مانگنے کا قصد کئے ہوئے تھا۔ یہاں اسے کوئی پہچاننے والا نہیں ہوگا۔ اس نے جنگلے کا چکر لگایا اور اپنی سوٹی سے راستہ ٹٹولنے لگا۔ راستے کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور سرسبز و شاداب سبزیوں کی کیاریوں سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا اور اس کی حالت پر ترس آتا تھا۔ آوارہ گرد چلتے چلتے رک گیا۔ وہ کام کے لیے نہ کہے؟ لغو بات۔ جب جوانی اور طاقت کے زمانے میں کام نہ کیا تو بھلا اب وہ کیا کام کر سکے گا کہ بوڑھا اور نحیف و نزار ہے۔ ہاں! اب بہتر یہی ہوگا کہ باورچی خانے میں جا کر بھیک کی صدا لگائے!

وہ مویشی خانے کے قریب آ گیا۔ کھسکتا، سرکتا ہوا۔ ایک آوارہ کتے کی چاپلوسی کا انداز لیے۔ عورتیں آگ کے سامنے سے آجا رہی تھیں۔ ایک نے دھوئیں میں سے اسے دیکھا اور بولی۔

"حضور کی کیا خدمت کریں؟"

"راہ مولا ایک روٹی مل جائے!" اس نے لجاجت سے کہا۔ اپنی کرخت اور بھدی آواز میں نرمی بھر دی تھی اور نقل کو اصل اور اصل کو نقل کر دکھانے کا پُرفریب فن وہ ان دنوں سیکھ چکا تھا جب چوری کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔

عورت نے اندر آنے کی دعوت دی۔ کچی اینٹوں کی دیوار کے ساتھ ڈھیلے تختوں کا بنچ پڑا تھا اندر آ کر اس پر بیٹھ گیا۔ عورت نے ایک لمحے کے لیے اسے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھا اور غصیلے کتے نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ بھونے ہوئے گوشت کا ایک ٹکڑا اور چند روٹیاں اس کے آگے رکھ دی گئیں۔ وہ مزے مزے سے ہولے ہولے کھا رہا تھا۔ اسے خوف سے آزاد، خوشگوار وقفہ میسر تھا اور اس قابل تھا کہ شکم کی دوزخ کو ٹھنڈا کر سکے جو تمام جانداروں پر مسلط ہے۔

جب غنودگی نے غلبہ پا لیا تو اس نے کچی اینٹوں کے ساتھ ٹیک لگا لی مگر جس عورت نے اسے مدعو کیا تھا، اس کے سوال نے جگا دیا۔ "کہیں دُور جا رہے ہو کیا؟"

وہ سامارا سے آ رہا تھا۔ ابھی ابھی ہسپتال چھوڑا تھا اور راہ پر ہو لیا تھا۔ کدھر؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

جب کسی کے بیوی ہو نہ بال بچہ۔ چھت سایۂ سر کے لیے ہو نہ روٹی پیٹ کے لیے۔ کمزوری اتنی ہو کہ کوئی کام کاج بھی نہ ہو سکے تو موت سے گریز کی خاطر سب جگہیں برابر ہیں۔ عورت نے اسے ہمدردی بھری دلچسپی سے دیکھا۔ اسے ہو کیا گیا تھا؟ اسے سخت زکام تھا جس سے آنکھیں متاثر تھیں اور عام بخار بھی تھا۔ یہ مرض نشیبی ملکوں میں ہر ایک کو ہو جاتا تھا۔ سالوں ادھر کی بات ہے جب وہ پٹین کے جنگلات میں کام کرتا تھا تو اس بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ایک چالیس سالہ گول مٹول عورت بڑے آرام سے کہنے لگی۔ "کہتے ہیں وہاں سبھوں کو بخار ہو جایا کرتا ہے!" پھر جوآن برآلس سے مخاطب ہوئی۔ "تمھارا نام؟"

اس دفعہ اس نے اپنا مخصوص قاعدہ توڑ ڈالا اور اجنبیوں کو صحیح نام بتا دیا۔ "میں ہوں آپ کا خاکسار۔ جوآن ورگاس۔"

عورت نے اس نام کو دہرایا اور بولی۔ "جوزفا کے خاوند کا نام بھی تو یہی تھا۔"

مفلوک الحال اور غلیظ آدمی بھونچکا سا رہ گیا اور اپنے سوزش زدہ پپوٹوں کو وا کر کے چپ ہو رہا! اک لمحے کے بعد کہنے لگا۔ "کیا یہاں کوئی جوزفا رہتی ہے؟"

"جی ہاں! وہی ہے نا جو اپنی بیٹی سمیت مالک کے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کہتے ہیں اس کا آدمی بھی تھا جو اسے چھوڑ کر چلا گیا۔"

"مالک یہیں کہیں ہو گا؟"

"نہیں تو! وہ گوتے مالا شہر میں گیا ہوا ہے اور جوزفا گایوں کے پیچھے لگی ہوئی ہے — کہتے والے باڑے میں۔"

"اللہ تمھیں جزائے خیر دے!" جوآن برآبس رخصت ہو کر گایوں کے باڑے کی راہ پر ہو لیا۔ وہاں جوزفا کو پا لیا اور اک نظر میں پہچان گیا۔ دودھ دوہنے والے لڑکوں کو سخت سُست کہہ رہی تھی۔ جوزفا۔ بوڑھی۔ بھاری بھرکم اور بدمزاج۔ اس کے پیچھے اس کی بیٹی کھڑی تھی۔ جوآن برآبس کی بیٹی اور قبول صورت نکل آئی تھی۔ اچھا، ہاں۔ اپنی سابقہ بیوی سے مل کر جوآن برآبس کے جذبات میں کچھ اتنا ہیجان بپا نہ ہوا۔ اس کی بیوی تنومند تھی۔ مدور تو مذ نکلی ہوئی تھی۔ سارجنٹ کی سی اونچی آواز میں چلا رہی تھی اور مویشی خانے کے مالک کی شان لیے ہوئے تھی۔ وہ اس کے پاس آیا اور کسی تمہید کے بغیر فوراً ہی بول اٹھا۔ "پہچان لیا ہے مجھے کہ نہیں؟"

وہ چپ چاپ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ہکا بکّا۔ پھر آگے بڑھی اور اس کے اس قدر قریب آگئی کہ اس کے منتشر گل مچھوں کو چھو رہی تھی۔ اپنی نفرت کو چھپانے کی ذرا کوشش نہ کی اور جو کچھ بھی تھا اسے پہچان لیا۔

"جوآن ورگاس! کب آزاد کیا انھوں نے تجھے؟" وہ اس شخص۔ نیم اندھی دہشتناک آنکھوں والے مجرم کے سامنے اسی طرح کانپ گئی جس طرح گزرے ہوئے دنوں میں کانپ جاتی تھی۔ "یہاں کیا کر رہے ہو تم؟"

جوآن برآبس منہ کے برابر تک ہاتھ لے گیا۔ منہ کھولا اور پُرسکون طنز کے ساتھ۔ خاموشی سے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی چیز نگل رہا ہو۔

ایک بار اور کھاتے پینے کے بعد جوآن برآبس نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور اسے بچوں کی سی ملائمت کے ساتھ پیار کرتا رہا۔ جب وہ چلی گئی تو جوزفا سے پوچھنے لگا "لے دے کر یہی ہے نا؟"

وہ اس کے سوال کا مطلب تاڑ گئی۔ "نہیں ایک اور بھی ہے؟"

"ایک اور بھی ہے؟ لڑکا؟"

"ہاں! لڑکا۔"

اس ڈاکو کی نظروں کے سامنے جوزفا مارے غصّے کے بازوؤں کو ہلاتے ہوئے چھوٹ پڑی۔ "خدا غارت کرے تمھیں! اور کس بات کی توقع تھی تمھیں؟ نو سال ہوئے کہ تم مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ہم تو..... اور کس بات کی توقع تھی تمھیں؟"

دفعتاً اس نے ہچکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ جوآن برآلبس کو محسوس ہو گیا کہ جو کچھ ہوا اس کا ہونا قطعی قدرتی امر تھا اور بآخر اس نے جوزفا کو بھی سینے سے لگا لیا۔

نیم اندھا آدمی مویشی خانے میں قیام پذیر ہو گیا اور جوزفا کی سفارش پر مقررہ فرائض کے بغیر گھر کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ وہ ہر فن مولا تھا اور ہر ایک کام کے لیے آمادہ و تیار۔ جلد ہی مویشی خانے کے ہر کیل کانٹے پر مویشی خانے کا اپنا نشان چسپاں نظر آنے لگا۔ ہر ایک گھوڑے کے نعل لگ گیا اور کوئی سازِ زین ایسی نہ تھی جو مرمت طلب رہی ہو! اور تو اور اس نے باغ کی نگہبانی تک اپنے ذمے لے لی اور مرغیوں کے ڈربوں کی نگہداشت کو بھی اپنے فرائض میں شامل کر لیا۔ ایسے ایسے کام جو سنبھالے تو مویشی خانے کے "کامیوں" نے اس کے نام دھر دیے "نانی اماں" اور "چھبیلی مرغی"۔

بھیس بدلے ہوئے جوآن برآلبس ایسی فضیحتوں پر مسکرا دیتا تھا۔ کاش یہ کمینہ اس بات کو صرف جان ہی لیتا جس کا اس کی بیوی کو شک شبہ بھی نہیں تھا ——— چودہ سال کی عمر میں چور پھر قاتل اور پھر قزاقوں کا سردار۔ آج اس کی پُرامن زندگی پُرسکون تحفظ سے کنارگیر تھی اور وہ اس قابل تھا کہ اپنی ماضی پر مسکرا دے! آدمی سے کیسی کیسی مجنونانہ حرکتیں سرزد ہوا کرتی ہیں! آج وہ محض جوآن ورگاس تھا — ایک نشیبی ملک کے مویشی خانے میں مسرور اور بھولا بسرا۔ اور حکام کو کیا پڑی تھی کہ اس کی تلاش کرتے پھرتے اور لاکھ کی ایک ہی کہیے تو یہ سب کچھ اس کی عورت کی عنایات کی بدولت حاصل ہوا تھا۔

وہ اسے نصیحت کر رہی تھی اور جو بات کہہ رہی تھی اس سے آگاہ بھی تھی۔

"جوآن! تم جو کچھ بھی تھے۔ ماضی کو مضمحل کہہ ڈالو۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنی بیٹی اور اس بچے کے لیے کام کرو کام جسے تعجب ہے کہ تم سے محبت ہے! تمھارا روپیہ گاڑھے پسینے کی کمائی ہے اور یہ تو امیروں کے چونچلے ہیں کہ اپنے نام نکوا اور عزت و شہرت کی فکر کرتے پھرتے ہیں اور جب تھوڑا بہت جمع ہو جائے گا۔ میاں! تو کسی وکیل کی خدمات حاصل کر لیں گے اور وہ تمھاری وکالت کر کے مخلصی کرا دے گا۔ یوں جیل میں سڑنے سے نجات ہو جائے گی۔ اور ہاں! اک بات یقینی جانو کہ تمھیں اپنے طور اطوار بدلنے پڑیں گے!" اور وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب وہ حد درجے کا ایماندار آدمی بن گیا تھا۔ کیا مجال جو کسی کو اس کی مرضی کے بغیر ہتھیائے۔ خوش قسمتی اس پر مسکرا رہی تھی اور تین روحوں کی ذمہ داری لیے ہوئے تھا۔ جب وہ لیکچر دے رہی تھی تو اس کے لب و لہجہ میں نیم استدلالی رنگ جھلکتا تھا جس سے اس کی دانائی کی اور بھی تصدیق ہوتی تھی۔ جوآن متعجب تھا۔

"ہم نے تھوڑا بہت جمع کر رکھا ہے۔ ..... ہر ایک مالک کو اُلّو بنا رہا ہے۔ ہم بھی اتنے کچے ثابت نہیں ہوں گے کہ باقیوں کو وہ کچھ لے جانے دیں جو ہم خود لے جا سکتے ہیں۔ ہمارا حق زیادہ ہے کہ ہم ہی ہیں جو ان کمینوں سے موٹی خاتے کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں! لیکن یہی کافی نہیں! تمھیں تو یہاں داروغے کا کام سنبھالنا چاہیے۔ اس کے لیے ہمیں شادی کرنی پڑے گی کہ آگے ہی لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر رکھی ہیں۔"

اس نے بیوی کے اس نامعقول خیال کو رَدّ کر دیا! وہ اور پھر اس کے لیے شادی کے گھنٹے بجیں۔ بالآخر وہ آمادہ ہو گیا۔ یہ جو شیطان کی خالہ ہے اس کی بیوی۔ یقیناً لوگوں کو سمجھتی ہے۔ شادی ہو گئی اور شادی کے بعد جوآن موٹی خاتے کا داروغہ بن گیا۔ مثالی موٹی خاتہ تھا اور مثالی تھا اس کا داروغہ!

انھوں نے مالک کے گلے پر چھری چلا چلا کر اپنے لیے فرنیچر سے آراستہ پیراستہ مکان بنوا لیا۔ بچت میں اضافہ ہو رہا تھا اور کاروبار پھیل رہا تھا، ہاں ہاں واقعی! تمام

مویشی خانے پر نظم و نسق کی حکمرانی تھی اور مالک اپنے مفاد کی کامرانی کے طریقوں سے مسحور ہو گیا تھا۔ وہی تھا جس نے جوزنا سے کہا تھا "اگر تم دوسروں کا مال غصب نہ کرو تو خدا سبھوں کو مالا مال کر دیتا ہے" ہمسایہ مویشی خانے والے دوستوں سے ڈینگیں مار کر کہتا تھا "وہ بوڑھا تو کمال استاد ہے بھئی! اس کی ایمان داری کی تو پوچھو نہیں اور کیا مجال جو کوئی اسے چکمہ دے جائے!"

یہ تھا بھید بچ! جو ساحلی لوگ وہاں کام کرنے آتے تھے۔ جھگڑالو اور بدنہاد ہوتے تھے اور تادم آخر ایسے ہی رہتے تھے اور وہ اپنے قزاقی کے دنوں کے تجربوں سے کام لے کر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان سے کام لیتا تھا۔ پہلے پہل تو وہ داروغے کی درشتی کو دیکھ کر بغاوت پر اتر آتے مگر پھر جوآن ورگاس کے جوہرِ ذاتی کو پہچان گئے۔ یا بر آں کس کو یہجیے کہ اسی نام سے دستخط کرتا تھا۔ چرواہوں میں ایک سخت گستاخ تھا۔ جب داروغے نے اپنے خنجر کے ایک ہی وار سے اس کا ہتھیار گرا دیا تو وہ مطیع ہو گیا۔ سبھی مان گئے کہ آٹھ آٹھ میل کے گرد و پیش میں کوئی ایسا نہ تھا جو چاقو اور خنجر چلانے میں استاد کا مدِمقابل ٹھہرتا یا گولی بھرنے اور بندوق کو اپنے منتخب نشانے پر چلانے کی مہارت میں اس سے سبقت لے جاتا! خوف نے اُس عقیدت کو جنم دیا جو ایک آدمی دوسرے کے لیے محسوس کرتا ہے اور ان کا سارا گروہ عقیدت مند ہو گیا اور اڑیل سے اڑیل بھی مغلوب ہو کر رہ گیا۔ ان کی عقیدت میں وہ سادہ اور بے لوث ارادت بھی شامل ہو گئی جو دیہات والوں کے دلوں میں سردار کے لیے جاگزیں ہو جاتی ہے — اک خام مال جس سے "کاڈلو" بناتے ہیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ "جناب جوآن" کو جو یہ فوقیت نصیب ہوئی تھی وہ گویا پیدا ہی اس کے لیے ہُوا تھا۔ اس کی بیوی سب سے پہلا شخص تھی جس نے اس کے سامنے اس بات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

"اگر تم اتنے سالخت اور جاہل نہ ہوتے تو تمھارے جرنیل بننے کی راہ صاف تھی"

ایک پرانے چرواہے نے کہا۔ "جنرل؟ پریذیڈنٹ کہو جی!"

جوآن ورگاس کی زندگی پر صرف ایک ہی فکر کی پرچھائیں چھائی ہوئی تھی اور وہ تھی اس کی اپنی بیٹی روسن داماب وہ پندرہ کے سن کو پہنچ رہی تھی اور کیلنڈروں والی تصویروں کی کوہستانی دوشیزاؤں کا سا حسن وجمال لیے ہوئے تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس پر مالک کی نگاہ پڑتی تھی۔

معاملہ پیچیدہ تو تھا ہی۔ سخت سنگین اس وقت ہو گیا جب ماں نے مالک کی دلالہ کے فرائض ادا کرنے شروع کر دیے۔!

ایک روز جوزفا جوآن ورگاس کے پہلو میں آ بیٹھی اور خلافِ معمول شیرینی و لطف کا اظہار کرنے لگی اور اسے ہمراز بناتے ہوئے اس شیرینی و لطف کی تان اس بات پر توڑی کہ "مالک کو روسن دا سے عشق ہے اور اس عشق کو عشق نہیں خالص سونے کی نہر سمجھو۔"

"استغفر اللہ!" بوڑھا بدمعاش غرایا تھا۔ "تمہارا بچہ تو زہر مار میں کر گیا، مگر یہ ہونے سے رہا!"

اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دلالہ کو وہ مارا کہ ہڈی پسلی ایک کر دی۔ اتنا پیٹا، اتنا پیٹا کہ خود بے دم ہو گیا اور اسے مکان کے فرش پر روتا پیٹتا۔ زخمی چھوڑ کر چلا گیا۔

دن گزرتے گئے اس نے بہتیرے حیلوں بہانوں سے کام لے کر اور رو رو کر سمجھایا کہ یہاں سے نکلنا پڑ جائیگا۔ مگر جوآن ٹس سے مس نہ ہوا۔

"بیوی! مر جاؤں گا مگر یہ نہیں ہو گا! اگر بے حیائی کا نام ہی عزت ہے تو اپنی سابقہ گداگری اور قزاقی کیوں نہ اختیار کر لوں!"

پھر سوچ بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "عزت کیا چیز ہوتی ہے۔ یہ بات کسی کے دل و دماغ میں نقش کرنا بڑا مشکل امر ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں قزاق ہوں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ بدمعاش اور حیل ساز ہوں لیکن میں کہوں کہ جن بُرے افعال کا میں مرتکب ہوا ہوں۔

وہ متصل میری اداسی اور پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ تم بتاؤ تم اسے اچھی نظر سے دیکھتی ہو کیا؟ میں اپنے آپ کو ایک ذلیل انسان سمجھتا ہوں مگر پھر بھی اپنے اور تمھارے گوشت پوست اور خون کو بیچنے کے لیے تیار نہیں! تم اسے لایعنی کہو۔ مگر میں ہوں ایسا ہی! میں نے کاہے کے لیے تمھارے کہنے پر صراطِ مستقیم اختیار کی صرف اس لیے کہ پہلے سے بھی بدتر ہو جاؤں؟ خدا کے لیے میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ ورنہ میں اپنے پرانے ہتھیاروں پر اتر آؤں گا۔ مالک اور لڑکی اور تم سب کو چاہیے کہ ذرا سنبھل کے قدم اٹھائیں کہ جوان برآمس ابھی مرا نہیں!"

جوزفا اپنے آنسوؤں کو پیش بند سے پونچھتے ہوئے منہ بسور بسور کر کہنے لگی: "جب سے تم نے ہماری اصلاح پر کمر باندھی ہے صاحب! وہ تو جبھی کا مر چکا ہے۔ واقعی مر چکا ہے۔ میں سوچتی رہی ہوں جوآن اور اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ جس راہ پر تم چل رہے ہو۔ اس پر چل کر جرنیل تو نہیں اولیا ضرور بن جاؤ گے!"

رامون ویل والے انکلان

میری بہن انتونیا

(۱)

کبھی گلیشیا کا سینتیاگو دنیا بھر کی زیارت گاہ تھا اور آج بھی اس کے بسنے والوں کی روحیں کسی معجزے کی رونمائی کے لیے ہمہ وقت چشم براہ ہیں۔

(۲)

ایک روز شام کو میری بہن انتونیا نے گرجے کو جانے کے لیے مجھے انگلی سے لگا لیا۔ انتونیا مجھ سے کہیں بڑی تھی۔ اس کا قد دراز تھا اور رنگ زرد۔ آنکھیں سیاہ تھیں اور مسکراہٹ میں اداسی کی جھلک تھی۔ میں ابھی بچہ ہی تھا کہ وہ مر گئی۔ لیکن مجھے کتنی اچھی طرح یاد ہے، اس کی آواز، اس کی مسکراہٹ اور اس کے ہاتھوں کی وہ خنکی جو میں اس وقت محسوس کرتا تھا جب وہ مجھے گرجے لے جاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس کی وہ آنکھیں یاد ہیں جن کی چمک میں حزن و ملال کی پٹ تھی اور جب وہ اس طالب علم کا تعاقب کرتی تھیں جو نیلے، بے آستین لبادے میں لپٹا ہوا غلام گردش کے چکر لگاتا تھا۔ مجھے اس طالب علم سے ڈر لگتا تھا۔ وہ دراز قامت تانت کی طرح سوکھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ مردے کا سا تھا۔ شیر کی سی آنکھیں تھیں — وحشت ناک اور ان کے اوپر درشت نفیس ساخت کی پیشانی تھی۔ جب وہ چلتا تھا تو گھٹنوں کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز نکلتی تھی جو اسے مردوں کے اور بھی قریب لے آتی تھی۔ میری ماں کو اسے دیکھنے سے گھن آتی تھی اور اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل رکھنے کی خاطر ان دریچوں کی جھلملیوں کو ہمیشہ بند رکھتی تھی جو پلے تیریا کی غلام گردش

کی طرف کھلتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس شام کو بھی، سدا کی طرح، اپنے نیلے بے آستیں لبادے میں اچھی طرح لپٹا ہُوا ٹہل رہا تھا۔ گرجے کے دروازے پر ہماری اُس سے مڈبھیڑ ہو گئی اور اس نے اپنے ڈھانچہ نما ہاتھ کو نکال کر مقدس پانی لیا اور میری بہن کو پیش کیا جو کانپ رہی تھی۔ انتونیا نے اسے ملتجیانہ دیکھا اور اُس نے تشنج آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں کہا۔ "آج میں بیحد خوش ہوں۔"

(۳)

ہم گرجے کے حجرے میں پہنچے جہاں چند معمر عورتیں زیرِ لب شام کی دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ یہ حجرہ وسیع اور تاریک تھا۔ اس کے چوبی فرش کی صدا روحی طرزِ تعمیر والی چھت کے گنبد میں گونج جاتی تھی۔ بچپن میں مجھے اس حجرے میں ایک دہشتناک طمانیت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے سایوں سے مجھے پتوں والے شاہ بلوط، کنج تاکستان یا کسی راہب کی دامنِ کوہ والی کھوہ کا خیال آجاتا تھا۔ یہاں ہمیشہ شام کو بوڑھی عورتوں کا حلقہ مصروفِ دعا ہوتا تھا۔ ان کی آوازیں۔ جذب و شوق سے معمور سنبیش ہائے لب میں ڈوب کر گنبد تلے پھیل جاتی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ شفقِ شام کی طرح انھوں نے دریچوں کے غیر شفاف شیشوں کے گلابوں کو منور کر دیا ہے۔ وہاں مدھم آوازوں میں کہی ہوئی مقدس دعاؤں کی سوئے آسمان پرواز اور چوبی فرش پر بھدے قدموں کی آواز سنی جا سکتی تھی اور جب پادری دعاؤں کی کتاب سے ہولے ہولے دعائیں پڑھتا تھا اور خادم گرجا اس کے کندھوں کے اوپر ایک روشن شمع لیے ہوتا تھا اور ننھی نقرئی گھنٹی کو آگے پیچھے کر کے بجاتا تھا، تو اس کی آواز بھی وہاں سننے میں آسکتی تھی۔

آہ اے کورنیلا کے گرجے! کب میری یہ تھکی ماندی روح تیرے سایوں کی تسکین بخش مرہم میں پھر غرق ہو جائے گی!

(۴)

جب ہم غلام گردش سے ہو کر گھر کو لوٹ رہے تھے تو مطلع تاریک تھا اور ترشح ہو رہا تھا۔ گھر پہنچنے پر میری بہن۔ میرا ہاتھ چھوڑے بغیر دوڑ کر سیڑھیاں چڑھ گئی اور وسیع ڈیوڑھی کی تاریکی نے اسے ضرور ڈرا دیا ہوگا۔ اندر آئے تھے کہ ماں دیوان خانے سے گزری اور ایک کھلے دروازے میں سے غائب ہوگئی۔ نہ جانے کیوں خوف اور تجسس کے مارے میں نے نظریں اٹھا کر انتونیا کو دیکھا۔ اس نے ایک لفظ نہ کہا اور جھک کر مجھے چوم لیا۔ زندگی کی سوجھ بوجھ کے بغیر بھی میں نے بہن کے راز کو بھانپ لیا۔ ہال میں میز پر ایک لمپ پڑا تھا جس کی ٹوٹی ہوئی چمنی دھواں دے رہی تھی۔ جب میں وہاں سے گزرا تو کسی سخت گناہ کے بوجھ کی طرح اس راز کا بار محسوس کر رہا تھا۔ دھوئیں کی دو شاخیں دو سینگ بن گئی تھیں جن سے مجھے شیطان کا خیال آگیا۔ جب بستر پر دراز ہوگیا تو اندھیرے میں مجھے یہ واقعہ یاد آتا رہا اور بہتیری راتیں میری نیند اس سے بیزار ہوتی رہی۔

(۵)

شام کو کئی دن مینہ برستا رہا۔ طالب علم کے غلام گردش میں ٹہلنے کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ مگر میری بہن شام کی عبادت کے لیے گرجے نہ گئی۔ کبھی کبھی جب میں دیوان خانے میں بیٹھا سبق پڑھ رہا ہوتا تو میں اس کو دیکھنے کی خاطر کھڑکی کھول دیتا۔ مرجھائے گلابوں کی باس سے گرجے کی فضا بوجھل تھی۔ وہ تنہا ٹہلتا نظر آتا ـــــ لبوں پر اینٹھی ہوئی مسکراہٹ لیے جب رات ہوگئی تو وہ یوں نعش سا دکھائی دیا کہ میں خوف زدہ ہوگیا۔ میں کانپتے ہوئے کھڑکی سے پرے ہٹ گیا لیکن نظریں وہاں سے نہ ہٹیں اور میرے سبق بن یاد کیے رہتے رہے۔ خاموش اور شاندار دیوان خانے سے اس کے جوڑوں کی آواز میرے کانوں میں آجاتی تھی۔ بلی نے تین بار میاؤں میاؤں کی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ میاؤں طالب علم کا نام ہو۔

میک سیمو برے تل

(۶)

سینت تیاگو کے نزدیک ہی، دامنِ کوہ میں برسے نل ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ۔ وہاں کے بڑھے نیکلی ٹوپیاں اور گھر کے بُنے ہُوئے بے آستین لبادے پہنتے ہیں۔ سردیوں میں بڑی بوڑھیاں اصطبلوں میں بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہیں کہ گھروں سے زیادہ یہاں گرمائش ہوتی ہے اور محافظِ گرجا گرجے کے صحن میں بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اس کے ڈنڈے کے زور سے نیچے صدر بلدیہ اور میونسپلٹی کے منشیوں کی قانونی تحریروں کو پڑھنا سیکھتے ہیں اور سب مل کر کسی ایسے عالی نسب خاندان کے مسودات میں سے پڑھتے ہیں جس کا اب وجود بھی باقی نہیں۔ میک سیمو ایسے ہی گھرانے کا فرد تھا۔ وہ سینت تیاگو میں دینیات کے مطالعے کی خاطر آیا تھا اور شروع شروع میں ایک بڑھیا جو گاؤں سے شہر بیچنے آتی تھی، اس کے لیے رئی کی روٹی اور سؤر کا گوشت لاتی جو اسے ہفتے بھر کے لیے کافی ہوتا! وہ چند دوسرے ساتھیوں سمیت ایک سرائے میں رہتا تھا جہاں انھیں صرف چارپائیوں کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ جب وہ مجھے لاطینی گرائمر، گھر پر پڑھانے پر مامور ہُوا تو وہ کم تر درجے کے کلیسائی منصب پر فائز ہو چکا تھا۔ برسے نل کے پادری نے انسانی ہمدردی کی بنا پر میری ماں سے اس کی سفارش کی تھی۔

ایک بوڑھی عورت میری ماں کا شکریہ ادا کرنے آئی اور سیبوں کی ٹوکری "تحفتہً" دے گئی۔ بعد میں لوگوں کا کہنا ہے کہ جس جادو نے میری بہن کو مسحور کر دیا تھا، وہ انہی سیبوں میں سے ایک سیب میں موجود تھا۔

(۷)

میری ماں نہایت دین دار عورت تھی اور اسے سحر و شگون میں کوئی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن اُس خیال کے پیشِ نظر جو اس کی بیٹی کو کھائے جا رہا تھا جھوٹ موٹ کہہ دیتی کہ اُسے بھی ان باتوں پر یقین ہے۔

طالب علم کی طرح انتونیا نے اب اس طرح کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لیا تھا کہ گویا وہ کسی دوسری دنیا کی ہو۔ اس کا وسیع دیوان خانے کے ایک کونے میں بیٹھے کشیدہ کاڑھنا مجھے یاد ہے۔ اس قدر قناونا بودسی نظر آتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ نہیں اس کا عکس ہے جو آئینہ میں نظر آ رہا ہے۔ اس کی حرکتوں سے بیدلی ٹپکتی تھی اور یوں لگتا تھا یہ حرکتیں اک دوسری دنیا کے ترنم سے ہمنوا ہیں اک دور دراز کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیلتی تھی۔ سفید اور اداس اداس رہتی تھی اور کسی پُر اسرار شفق میں محصور نظر آتی تھی اور اس قدر پیلی پڑ گئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا چاند کی طرح ہالے میں گھر گئی ہے۔ میری ماں پردے ہٹا کر اسے دیکھ لیتی اور چپ چاپ چلی جاتی۔

(۸)

دھوپ والی پیلی سنہری شامیں لوٹ آئیں اور پہلے کی طرح میری بہن نے مجھے انگلی سے لگا کر پھر شام کی عبادت کے لیے کورتیلا حجرے میں جانا شروع کر دیا۔ مجھے خوف کھائے جا رہا تھا کہ پھر طالب علم کا سامنا ہوگا۔ وہ ہڈیوں ہی ہڈیوں والا ہاتھ ہمارے آگے بڑھا دے گا اور اس میں سے مقدس پانی ٹپکتا ہوگا۔ میں نے سہم کر جو اپنی بہن کو دیکھا تو اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میک سیمو برے تل جو ہمیشہ شام کو غلام گردش میں موجود رہتا تھا، ہمیں دیکھتے ہی غائب ہو گیا اور جب ہم گرجے کے بیچ سے گزر رہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ محرابوں کے سایوں میں سے اُبھر رہا ہے۔ ہم حجرے میں داخل ہوئے تو وہ دروازے کی سیڑھیوں پر دوزانو ہو گیا اور ان سلوں کو چومنے لگ پڑا جن پر میری بہن نے قدم رکھے تھے۔ وہ دوزانو تھا۔ بے آستین لبادہ کندھے سے گر گیا تھا اور اپنے سامنے ہاتھ جوڑے یوں معلوم ہوتا تھا کہ سنگ ترتب پر کسی نے بت تراشا رکھا ہے۔ ایک روز شام کو ہم گرجے سے گھر جا رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں سائے کی طرح اس کا ہاتھ بڑھ رہا ہے اور بڑھتے ہی اپنی انگلیوں میں انتونیا کے کرتے کا اک کونا دبوچ بیٹھا ہے۔

"میں جان پر کھیل رہا ہوں ..... میں جو کہوں تمھیں سننا ہی پڑے گا۔ تمھیں بتا کر ہی رہوں گا کہ کس صدمے سے مر رہا ہوں۔ کیا تمھارا یہی ارادہ ہے کہ آئندہ تم مجھے اک نظر بھی نہ دیکھو گی؟"

انتونیا غنچے کی طرح زرد ہو رہی تھی، سرگوشی کے انداز میں بولی "مجھے جانے دیجیے دان میک سیمو مجھے چھوڑیے گا۔"

"میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا، تم میری ہو، تمھاری روح میری ہے۔ میں تمھارے جسم کا خواہاں نہیں کہ وہ فرشتۂ موت کی چیز ہے۔ میری طرف دیکھو، اپنی نظروں کو میری نظروں میں ڈال کر انھیں اعتراف کرنے دو! میری طرف دیکھو!"

اس زرد ہاتھ نے اس زور سے میری بہن کا کرتا کھینچا کہ اس کا ایک ٹکڑا اچک کر آ رہا اور میری بہن کی معصوم نگاہیں اس کی آنکھوں کی آتشیں اور درخشاں گہرائیوں میں دُور تک ڈوبتی چلی گئیں۔ اس رات جب اندھیرے میں مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا تو میں یوں چلا اُٹھا گویا میری بہن گھر سے بھاگ گئی ہے۔

(۹)

دیوان خانے میں مرجھائے ہوئے گلابوں کی بُو چھائی ہوئی تھی۔ میں یہیں اپنی لاطینی گرامر کے سبق پڑھتا رہتا تھا اور کبھی کبھی سہ پہر کو ماں بھی آ جاتی تھی۔ وہ بڑے صوفے کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی جس پر قرمزی رنگ کا مشجر کپڑا پڑا تھا اور وہاں بیٹھے بیٹھے آہیں بھرتی اور تسبیح پھیرتی اور بوقتِ ورد تسبیح کے دانوں کی حرکتوں کی آواز آہوں کی آواز کے ساتھ ساتھ میرے کانوں میں پہنچتی اور میری ماں بڑی پیاری عورت تھی۔ سرتاسر حسین و سفید۔ ہمیشہ ریشم میں ملبوس رہتی تھی۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیاں غائب تھیں اور اسے وہ سیاہ دستانے کے اندر رکھتی تھی۔ دوسرا ہاتھ پھول کی مانند تھا، انگوٹھیوں سے بھرا ہوا۔ اس کو ہم چوما کرتے تھے اور اسی سے وہ ہم کو پیار کرتی تھی۔ دوسرے ہاتھ کو وہ رومال کی جھلر

میں چھپائے رکھتی اور یہ سارے کا سارا اس وقت نظر آتا جب وہ اپنے لیے ہوا میں صلیب کا نشان بناتی۔ اس کے منہ کے گلاب، سفید پیشانی کی درخشانی اور مریم عذرا کے سے سینے کے سامنے یہ ہاتھ کس قدر افسردہ کن اور تاریک تھا!

میری ماں سونے میں دھنس جاتی اور دعاؤں میں مصروف رہتی اور دوسرے کونے میں جو روشنی نیم وا دریچوں سے اندر آتی تھی اسی روشنی میں میں بیٹھا لاطینی کے سبق یاد کرتا تھا۔ میں اپنی گرامر کی کتاب، ان پرانی طرز کی میزوں میں سے ایک پر کھولے رکھتا جن کے اوپر کے تختے پر شطرنج کے خانے کھُدے ہوتے ہیں۔ اس وسیع و خاموش دیوان خانے میں مشکل سے کچھ دکھائی دیتا تھا۔ کبھی کبھی میری ماں دعائیں مانگنے کے دوران کہہ دیتی کہ "کھڑکی ذرا اور کھول دو"۔ میں اس اجازت سے فائدہ اٹھاتا اور غلام گردش میں جھانکتا جہاں طالب علم شام کے سایوں بھرے جھٹ پٹے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا تھا۔ اس سہ پہر کو وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگیا۔ ابھی میں منہ ہی منہ میں لاطینی یاد کر ہی رہا تھا کہ کسی نے دستک دی۔ یہ شخص فراں سسکی راہب تھا جو حال ہی میں پاک سرزمین سے لوٹ کر آیا تھا۔

(۱۰)

باپ برنز دمیری ماں کا پادری رہ چکا تھا۔ جس کے سامنے وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کیا کرتی تھی اور اپنے سفرِ زیارت کی واپسی پر اس کے لیے ایک تسبیح لایا تھا جو اولی وست پہاڑی کے زیتونوں کی گٹھلیوں کی بنی ہوئی تھی۔ جب سے وہ اپنی سیتیا گو والی خانقاہ میں لوٹا تھا، اس شام کو اس کی یہ دوسری ملاقات تھی۔ ادھر وہ اندر آیا، ادھر میں نے گرامر وہیں رکھی اور اس کے ہاتھ چومنے کو دوڑا گیا۔ میں دو زانو ہوگیا اور برکت لینے کے انتظار میں اوپر نظر اٹھا کر اسے تکنے لگا۔ لیکن مجھے یوں معلوم ہُوا کہ برکت دینے کی بجائے وہ ہوا میں دو سینگوں کی شکل بنا رہا ہے۔ شیطان کی اس شرارت سے ڈر کر میں نے آنکھیں موند لیں اس فریب

کا مقصد یہ تھا کہ میں گناہ کا ارتکاب کر دوں۔ پادوا کے سینٹ انتھنی کی زندگی میں بھی اسی قسم کی بات کا تذکرہ ہے اور ان ولیوں کی کہانیوں میں بھی یہی چیز نظر آتی ہے جنھیں میں بآواز بلند اپنی ماں اور انتونیا کو سناتے کو تھا۔ باپ برزو جیسے میری دادی کو اپنے زمانے کا ولی کہنے میں تامل نہ ہوتا۔ جلدی سے مری ماں کو تسلیمات کہنے کے لیے آگے بڑھا ماضی میں میری اس کا ہیمنا رہ چکی تھی۔ وہ میرے منڈے ہوئے سر پر صلیب کا نشان بنانا بھول گیا جس میں دو کان یوں نکلے ہوئے تھے کہ اب اڑے کہ اڑے۔ بچے کا سر بچپن کی اندوہ افترا زنجیروں کے بوجھ سے جھک رہا تھا: لاطینی ذن کو اور مُردوں کے خوف رات کو۔

راہب نے میری ماں سے چند الفاظ زیر لب کہے اور وہ دستانے والا ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔

"باہر چلے جاؤ، بچے۔"

(۱۱)

باسی لیسیا میری ماں کی پرانی اتا تھی اور دروازے کے باہر دبکی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا ہی تھا کہ اس نے وہیں مجھے کوٹ سے پکڑ لیا اور میرے منہ پر اپنی جھریوں پڑی ہتھیلی رکھ کر کہنے لگی۔

"خبردار! جو اک لفظ بھی بولے۔ شرارتی۔"

میں اسے گھور رہا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے پتھر کی وہ مضحک صورتیں یاد آگئیں جو گرجے پر بنی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے بعد اس نے مجھے آرام سے دھکیل کر کہا۔ "دوڑ جاؤ بھیّا۔"

میں نے اس کے جھریوں والے بوڑھے ہاتھ کو کندھے سے جھٹک دیا اور اس کے پہلو میں بیٹھا رہا۔

"ایک روح کو بچانے کا سوال ہے۔" راہب کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

باسی لیسیا نے پھر مجھے دھکیلا۔ "بھاگ جاؤ یہاں سے، تمھارے سننے کی باتیں نہیں ہیں۔"

اور ساری کی ساری کپڑی ہو کر اس نے دروازے کی درز کے ساتھ آنکھ لگا دی۔ میں بھی اس کے پہلو میں دبکا رہا۔ اس دفعہ باسی لیسیا نے اتنا ہی کہا "جو کچھ سنو، بھول جائیو۔" میں ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ وہ واقعی پتھر کی مضحک صورت کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ اب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ پتھر کی وہ صورت بلّی کی تھی یا کتے، بھیڑیے کی۔ مگر تھی اُن صورتوں میں سے ایک ضرور جو گرجے کی کانس پر بیٹھی جھانک رہی تھیں۔

(۱۲)

دیوان خانے کی گفتگو ہمارے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔ راہب خاصی دیر تک بولتا رہا۔ "آج صبح کا ذکر ہے۔ ایک شیطان کا درغلایا ہُوا نوجوان ہماری خانقاہ میں آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ وہ اک نامبارک محبت میں گرفتار ہے اور اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں شیطان سے بھی امداد طلب کر لی ہے۔ اس کو رات کے پچھلے پہر زوال پذیر فرشتہ راکھ کے بادلوں میں اپنے چمگادڑوں والے پروں کے ساتھ دکھائی دیا۔ جو اک بے پناہ شور مچائے ہُوئے تھے۔"

"اف خدایا!" میری ماں نے آہ بھر کر کہا۔

راہب نے بات جاری رکھی۔ "شیطان نے اس سے کہا ہے کہ اگر وہ معاہدے پر دستخط کر دے تو یہ محبت کے معاملے میں اس کی امداد کے لیے تیار ہے۔ لڑکا چونکہ بپتسمہ شدہ عیسائی تھا۔ اس لیے ہچکچایا اور صلیب سے اسے پرے ڈالا۔ آج سویرے اس نے اقرارِ گناہ کی نشست گاہ میں میرے سامنے ان سب باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ اپنی شیطانی حرکتوں سے توبہ کر لے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ میری تمام نصیحتیں اس پہ کچھ اثر نہ کر سکیں۔ اس کی روح کھو جائے گی۔"

میری ماں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "میں یہ زیادہ بہتر سمجھوں گی کہ بچی میری آنکھوں کے سامنے مر جائے۔"

راہب کی آواز پُراسرار طور پر ہیبت ناک ہو گئی تھی۔ بولے گیا۔

"اگر وہ مر گئی تو شاید لڑکا جہنم پر فتح یاب ہو جائے۔ اور جو زندہ رہی تو شاید دونوں ہی کھو جائیں ..... اور پھر تم سی بے چاری عورت کس طرح اس کم بخت دانائی کا مقابلہ کر سکتی ہے؟"

"اللہ کی عنایت سے۔"

گفتگو میں ایک طویل وقفہ آ پڑا جس میں راہب جواب سوچنے میں محو نظر آتا تھا۔ باسی لیسیا نے مجھے سینے سے چمٹا رکھا تھا اور جب ہم نے راہب کے چپلوں کی آواز سنی تو بڑھیا نے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی کہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ لیکن اس کی آواز سنائی دینے پر وہ بیٹھ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹی! اللہ کی عنایت سدا ہمارے ساتھ نہیں ہوا کرتی۔ یہ تو چشمے کی طرح بہتی ہے اور پھر خشک بھی ہو جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اپنی نجات کی بابت سوچتے ہیں اور اپنے بھائی بندوں کے لیے کچھ پیار محسوس نہیں کرتے یہی ہیں خشک چشمے۔ جب تم نے یہ سنا کہ ایک مسیحی کی روح خطرے میں ہے تو بتاؤ بھلا تمھارے دل پر کیا گزری؟ تم نے اسے جہنم کی قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا کچھ کیا؟ کیا اس لیے لڑکی کو دینے سے انکار کر رہی ہو کہ وہ اسے شیطان کے ہاتھوں سے حاصل کرے ....."

میری ماں چلا اٹھی "یسوع میری امداد کرے گا۔"

راہب کی آواز انتقام سے کانپ گئی۔ "پیار سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔ صرف اپنے باپ، خاوند، یا بیٹے کو پیار کرنا تو مٹی کے بتوں کے سامنے جھک جانے کے مترادف ہے۔ اگر تمھیں اس بات کی سوجھ نہیں ہے تو تم بھی طالب علم برتے تل کی طرح صلیب کو پاؤں تلے روندر ہی ہو۔"

اک آواز سی آئی گویا وہ باہر آ رہا ہے۔ جب میں اور باسی لیسیا جلدی سے چلے تو ایک

کالی بلّی ہمارے سامنے سے بھاگ کر نکل گئی اور کسی نے نہ دیکھا کہ باپ برنرڈ کب رخصت ہوا ہے۔

سہ پہر کو باسی لیسیا خانقاہ میں گئی تو اسے پتا چلا کہ وہ میلوں دور کسی کام کو چلا گیا ہے۔

(۱۳)

مینہ کے تھپیڑے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے اور سہ پہر کی اداس اداس روشنی کمروں میں بکھری ہوئی تھی۔

انتونیا دریچے کے پاس بیٹھی کشیدہ کا کام کر رہی تھی اور ماں آرام سے صوفے میں بیٹھی تھی۔ وہ انتونیا کو تک رہی تھی اور اس کی آنکھیں اس پر یوں جم گئی تھیں گویا کسی بت کی ہوں۔ ہم پر گہری خاموشی مسلط تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک دفعہ بیٹھے بیٹھے انتونیا پر خواب کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے سوئی کو فضا میں متوازن کر دیا۔ ماں نے بلند آواز سے سرد آہ کھینچی اور بہن کی آنکھوں کے پپوٹے یوں پھڑکے جیسے وہ نیند سے بیدار ہو رہی ہو۔ بہت سے گرجوں کے گھنٹے بجنا شروع ہو گئے۔ باسی لیسیا روشنیاں لیے اندر آئی۔ سب دروازوں کے آگے پیچھے دیکھا بھالا اور کھڑکیوں کی آگل چڑھا دی۔ انتونیا پھر کشیدے پر جھکی محوِ خواب تھی۔ مجھے ماں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بازو کو میرے گرد حائل کر دیا۔ باسی لیسیا اپنی تکلی لے آئی اور صوفے کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔ ماں کے دانت بج رہے تھے۔ ان کے کٹکٹانے کی آواز میں نے بھی سنی اور باسی لیسیا نے بھی۔ باسی لیسیا نے اُوپر نگاہ کی تو میری ماں نے کراہ کر کہا۔

"صوفے کے نیچے سے بلّی کو بھگا دو۔"

باسی لیسیا جھک گئی "بلّی ہے کہاں۔"

"جب تو روشنیاں لائی تھی، تو یہ بھی تمھارے ساتھ آ گئی تھی۔"

"مجھے تو نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"تو سن بھی نہیں سکتی اسے۔"

بڑھیا نے اپنی تکلی کو صوفے کے نیچے ادھر ادھر اور آگے پیچھے پھیر کر کہا۔

"نا۔ کچھ بھی نہیں۔"

"انتونیا، انتونیا!" ماں نے چلّا کر کہا۔

"جی ہاں!"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں ماں!"

"بلّی کا نوچنا سنتی ہو؟"

انتونیا نے ایک منٹ کان لگائے رکھا۔ "اب تو نہیں نوچ رہی ہے۔"

میری ماں ساری کی ساری لرز گئی۔

"یہ عین یہاں فرش پر میرے سامنے نوچ رہی ہے، لیکن نظر مجھے بھی تو نہیں آتی۔"

اس نے میرے کندھوں پر رکھی ہوئی انگلیوں کو بند کر لیا۔ باسی بیسیا روشنی لانے چلی گئی لیکن ہوا کے جھونکے نے جس سے سارے دروازے کھڑکھڑا اٹھے تھے اسے بجھا دیا۔

میری ماں نے چیخیں مارتے ہوئے بہن کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ بڑھیا نے آبِ مقدس میں ڈوبی ہوئی زیتون کی شاخ سے سارے کونوں میں پانی چھڑک دیا۔

(۱۴)

ماں اپنے کمرے میں اٹھ آئی۔ گھنٹہ بجنے پر باسی بیسیا جلدی سے نکل گئی۔ انتونیا نے کھڑکی کھولی اور چوک کو خواب میں چلنے پھرنے والے شخص کی نظروں سے تکنے لگی۔ وہ ہولے ہولے پیچھے ہٹی اور پھر فوراً باہر چلی گئی۔ میں تن تنہا رہ گیا۔ میں نے دریچے کے

شیشے کے ساتھ پیشانی لگا رکھی تھی اور روشنی کی آخری شعاع کا غائب ہونا دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہُوا جیسے میرے کانوں میں گھر کے اندر سے چیخوں کی آوازیں آ رہی ہیں لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ ہل سکوں۔ مجھے مبہم سا خیال ہے کہ وہ لوگ تھے کچھ ضرور۔ مگر میں بچّہ تھا۔ مناسب یہی سمجھا کہ ان سے محترز رہوں۔ مَیں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور ڈراؤنے اور پریشان خیالوں سے دماغ بھنّا رہا تھا۔ مجھے اس وقت کی دھندلی سی یاد آ رہی تھی جب میں کالی کوٹھری میں زجر و توبیخ کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ ناخوشگوار یادیں جاگ اٹھی تھیں اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا میری روح کا احاطہ کر رہی ہیں۔ مَیں اپنی عمر کے لحاظ سے کہیں ہوشیار اور محتاط بچّہ تھا اور ان میں تھا جو کھلی آنکھوں کے ساتھ، کھیل کود چھوڑ کر بڑی بوڑھیوں کی گپوں میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ شور ختم ہو گیا اور جب گھر پر قطعی خاموشی طاری ہو گئی تو میں دیوان خانے سے بھاگ نکلا۔ آگے سے باسی لیسیا مل گئی جو دوسرے کمرے سے نکل ہی رہی تھی۔ جاتے جاتے مجھ سے زیرِلب کہنے لگی۔

"شور نہ مچائیو۔ شرارتی۔"

میں ماں کے کمرے کے باہر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ اندر سے نشتم آلودہ بڑبڑاہٹ کی آواز اور خوشبودار سرکے کی تیز بُو باہر آ رہی تھی۔ میں نے ذرا بھی شور نہ کیا اور اندر کو کھسک آیا۔ ماں بستر پر دراز تھی اور سر پر کپڑے پڑے تھے۔ سیاہ دستانے والا ہاتھ برف سی سفید چادروں کے سامنے صاف نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور پھٹی پھٹی نظر آتی تھیں۔ جب میں اندر آیا تو اس نے سر ہلائے بغیر انھیں دروازے کی طرف پھیر دیا۔

"بیٹے! اس بلّی کو میرے پاؤں کے پاس سے ہٹا دو۔"

مَیں اس کے پاس گیا تو ایک کالی بلّی اچھل کر فرش پر آ رہی اور باہر کو نکل بھاگی۔ باسی لیسیا دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے سارا ماجرا دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگی۔ "تمھارا دل

معصوم تھا۔ اس لیے تم نے اسے بھگا دیا۔"

(۱۵)

مجھے وہ طویل اور بے کیف دن یاد ہے جب میری ماں کمرے میں بیٹھی تھی جس میں بند جھلملیوں کی وجہ سے بصد مشکل روشنی اندر آ رہی تھی۔ ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے۔ سر رومالوں میں لپٹا ہوا تھا اور چہرہ بے آب و رنگ تھا۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہتی تھی اور جب اور لوگ باتیں کرتے تھے تو اپنی جامد آنکھوں کو ادھر پھیر دیتی گویا ان پر خاموشی عائد کر رہی ہو۔ یہ ایسا دن تھا جب شفق پھولی ہوئی تھی اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔ جب نوکر روشنیاں لے کر اندر آئے تو معاً دن کی روشنی ختم ہو گئی۔ ماں چلائی "ارے بلی کو لیجو۔ میری پیٹھ پر ہے۔ کھینچ بھگاؤ اسے۔"

باسی تیسیا میری طرف آئی ادراک رازدارانہ انداز کے ساتھ مجھے ماں کی سمت دھکیل کر لے گئی۔ وہ مجھ پر جھک گئی۔ اس کی ہڈی میں لرزش تھی اور مے کے بال میرے منہ کو چھو رہے تھے۔ اس نے کان میں دھیمے سے کہا "ہاتھوں کی صلیب بناؤ۔"

میں نے ہاتھوں کی صلیب بنائی اور باسی تیسیا نے انھیں میری ماں کی پیٹھ پر رکھ دیا اور پھر سرگوشی میں بولی "بھیّا! کچھ معلوم بھی ہو رہا ہے؟"

میں سہما ہوا تھا۔ اسی آواز اور لہجے میں بولا۔ "کچھ بھی معلوم نہیں ہو رہا ہے، باسی تیسیا۔"

"کوئی شے گرم نہیں معلوم ہو رہی ہے کیا؟"

"مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم ہو رہا ہے، باسی تیسیا!"

"بلی کے بال نہیں لگ رہے ہاتھوں کو؟"

"بالکل نہیں!"

ماں کی چیخوں سے میں اتنا ڈر گیا کہ زار زار رونے لگ پڑا۔

باسی لیسیا نے مجھے اٹھالیا اور ہال میں لے آئی۔

"او شرارتی! آج تم نے کوئی خراب بات کی ہے۔ جبھی تو دشمن کو بھگا نہیں سکے۔"

وہ پھر سونے کے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے گناہوں کے خیال سے افسردہ اور خوفزدہ ہو کر ہال میں ٹھہرا ہوا تھا۔

چیخوں کی آوازیں آتی رہیں اور نوکر روشنیاں لیے سارے گھر میں گھومتے رہے!

اس طویل اور بے حد طویل دن کے بعد ایک رات آئی اسی دن کی طرح طویل اور بے حد طویل دلیوں کے مجسموں کے سامنے شمعیں فروزاں تھیں۔ نوکر دروازوں سے باہر سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے اور دروازوں میں کھلتے وقت چرچر ہوتی تھی۔ میں باہر ہال میں ایک میز کے پاس بیٹھا تھا جس پر دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے میں نے گولی لاتھ جن کی کہانی کی بابت سوچنا شروع کر دیا۔ انتونیا قریب سے گزری اور خوابناک آواز میں پوچھنے لگی،

"کیا کر رہے ہو یہاں؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو سبق کیوں نہیں یاد کرتے؟"

میں نے اسے گھور کر دیکھا مجھے اس بات پر تعجب تھا کہ بھلا ماں کے بیمار ہوتے ہوئے وہ مجھ سے پڑھنے کی توقع کیسے کر رہی ہے؟ وہ ہال سے گزر کر ادھر کو چلی گئی اور میں بے دین جن کے پاس چلا آیا۔ جو ایک ہی پتھر سے ہلاک ہو گیا تھا۔ داؤد لڑکے نے اسے اپنی غلیل سے ہلاک کر ڈالا تھا اور جس طرح وہ غلیل کو استعمال میں لایا تھا، اس وقت اس سے زیادہ حیرت کی بات مجھے اور کوئی نظر نہ آئی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کے جو دریا کنارے سیر کو جاؤں گا تو غلیل بازی کی مشق کروں گا۔ مجھے اک مہم۔ پریشان سا خیال آیا کہ طالعلم برتے تل کے ماتھے کو پتھروں کا نشانہ بنا دوں گا۔ انتونیا معطر لے ونڈر کی شاخیں اور پتے قاب

میں لیٹے لوٹ آئی۔

"تم سوتے کیوں نہیں جاتے، بھیّا؟"

اور پھر وہ جلدی سے چلی گئی۔ میں نے میز پر سر رکھا اور سو گیا۔

(۱۷)

مجھے یہ معلوم نہیں کہ یوں صرف آج رات ہی ہوا کہ اور راتوں کو بھی ہوتا رہا کہ گھر پر سدا تاریکی چھائی رہتی تھی اور شمعیں سدا دیوں کے آگے روشن رہتی تھیں۔ میں سویا ہوا تھا کہ ماں کی چیخیں، نوکروں کی پُراسرار سرگوشیاں اور دروازوں کی چرچر کی آوازیں کانوں میں پڑیں اور گھنٹی کی آواز بھی سنائی دی۔ گھنٹی بازار تک جاتی تھی۔

باسی لیسیا شمعدان لے گئی اور دو نئی موم بتیاں لے کر آگئی جو مشکل سے روشنی دے رہی تھیں ایک دفعہ جو میں نے میز سے سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے اس پار ایک آدمی کوٹ کے بغیر بیٹھا ہوا ہے اور سینے پر دنے کا کام کر رہا ہے۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور سر گنجا تھا۔ سرخ صدری پہن رکھی تھی۔ اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔

"سوئے ہوئے تھے بڑھا کو میاں؟"

باسی لیسیا شمعوں کی گل گیری کر رہی تھی "میرا بھائی یاد نہیں رہا تمھیں؟"

میرے دماغ پر نیند کا خمار چھایا ہوا تھا مگر پھر بھی مجھے جوآن دی البرت کی صورت یاد تھی۔ جب میں بڑھیا کے ساتھ گرجے کے میناروں کو جاتا تھا تو کئی دفعہ اُسے دیکھا تھا۔ باسی لیسیا کا بھائی چبارے میں بیٹھ کر پادریوں کے لبادوں کی درستی اور سینے پر دنے کا کام کرتا تھا۔

باسی لیسیا نے آہ بھر کر کہا "وہ یہاں اس لیے آیا ہے کہ کاتبلا کے لوگوں کو اطلاع دے کہ وہ کب یہاں آ کر آخری رسمیں ادا کریں۔"

میں نے رونا چیخنا شروع کیا تو سبھوں نے شور کرنے سے ممانعت کر دی۔

ماں چلا رہی تھی۔ "بھگاؤ اس بلی کو۔ بھگاؤ۔"

(۱۸)

جو سیڑھیاں چبارے کو جاتی تھیں ان کے قریب۔ سونے کا کمرہ تھا۔ باسی لیسیا اس کے اندر گئی اور ایک لکڑی کی سیاہ صلیب نکال لائی۔ اس نے چند الفاظ منہ ہی منہ میں کہے جنہیں میں سمجھ نہ سکا۔ پھر اس نے میری پیشانی، سینے اور پہلوؤں پر صلیب کے نشان بنائے اور صلیب مجھے دے دی اور اپنے بھائی کی قمیض اُٹھا کر کہنے لگی "وہ آزاد ہونے کو کہہ رہی ہے تو اسے آزاد ہی کر دینا چاہیے۔"

وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ ماں کے کمرے کی طرف لے گئی جو ابھی تک چلا رہی تھی "بھگا دو اس بلی کو۔ بھگا دو!"

دروازے پر مجھے کہنے لگی "چپ چاپ جا کر صلیب کو تکیے پر رکھ دو۔ دیکھو ذرا شور نہ ہونے پائے۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔"

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور ہاتھ پنجے بن گئے تھے۔ ایک ہاتھ سفید تھا اور دوسرا کالا۔ انتونیا اسے تک رہی تھی۔ زرد رُو اور ملتجیانہ میں نیچوں کے بل دوسری طرف کو نکل گیا اور بہن کی آنکھوں پر نگاہ کی جو سیاہ تھیں۔ گہری اور خشک۔ میں چپ چاپ پلنگ پر چڑھ گیا اور صلیب کو تکیوں پر رکھ دیا۔ دروازے پر باسی لیسیا جھکی ہوئی دبکی بیٹھی تھی۔ جب میں ماں کی طرف آ رہا تھا تو اسے بھی اک نظر دیکھ لیا۔ ابھی میں نے صلیب رکھی ہی تھی کہ ماں تڑپ اٹھی اور اسی وقت ایک کالی بلی بستر کی چادروں میں سے نکل کر فرش پر آ کودی اور دروازے کی طرف دوڑ گئی۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ آنکھیں بند ہی تھیں کہ میں نے قمیض کی کھٹ کی آواز سنی۔ پھر بڑھیا پلنگ کی جانب بڑھی اور مجھے باہر لے گئی۔ ہال میں میز کے پیچھے درزی کا تھکنا سایہ پڑ رہا تھا۔ وہیں اس نے مجھے دو ٹکڑے دکھائے جن کے لہو سے اس کے ہاتھ سنے ہوئے تھے۔ کہنے لگی "یہ بلی کے کان ہیں۔"

(۱۹)

خلط ملط دعاؤں کی زیرلب آوازوں اور موم کی بوؤں سے گھر معمور تھا۔ ایک پادری منصبی لباس پہنے ہوئے لب پر انگلی رکھے جلدی جلدی آیا۔ جو اُن دی آلبرت اسے راستہ دکھا رہا تھا۔ درزی پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ سر کو ایک طرف کندھے پر جھکا رکھا تھا۔ ٹوپی کو دو انگلیوں کے درمیان گھما رہا تھا اور اس کا بے آستیں لبادہ پیچھے پیچھے گھسٹتا آتا تھا۔ ان کے بعد ایک یتیم ساگردہ ہونے ہولے آرہا تھا۔ جس کی دعائیں مدھم آواز میں جاری تھیں۔ اس گروہ کے آدمی ایک قطار میں کھڑے ہوگئے جو میری ماں کے دروازے تک پہنچتی تھی۔ کمرے میں باسی لیسیا اور انتونیا دو زانو تھیں، انھوں نے نقاب پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں موم بتیاں اٹھا رکھی تھیں۔

غلام گردش کی دیوار کے ساتھ ساتھ بوڑھی عورتیں قطار باندھے کھڑی تھیں۔ ان کے سائے ان کے جسموں سے پیوست ہو رہے تھے۔ ان کے خمیدہ ہاتھوں نے مجھے آگے کو بڑھا دیا۔ ماں کے کمرے میں ایک خاتون چلا چلا کر رو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں معطّر رومال تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور میرے ساتھ دو زانو ہوگئی۔ وہ موم بتی کو سنبھالنے میں میری امداد کر رہی تھی۔ پادری ماں کے پلنگ کا طواف کر رہا تھا اور کتاب سے لاطینی دعائیں پڑھتا جاتا تھا۔ جب انھوں نے چادریں ہٹائیں تو مجھے ماں کے پاؤں دکھائی دیے۔ اینٹھے ہوئے اور زرد۔ اب میں سمجھا کہ ماں مرگئی ہے۔ میں حسینی خاتون کے گرم گرم بازوؤں میں سمٹا ہوا تھا۔ خوفزدہ اور ساکن و جامد! مجھے چیخنے یا حرکت کرنے سے خوف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھکی ہوئی تھی اور اپنے چہرے کی اک طرف کو میرے گال کے ساتھ ٹکا رکھا تھا اور ماتمی شمع کو اٹھائے رکھنے کے لیے سہارا دے رہی تھی۔

(۲۰)

باسی لیسیا نے مجھے خاتون کے بازوؤں سے جدا کیا اور ماں کی چارپائی کے پاس

لے آئی - ماں کا جسم پیلا تھا اور اکڑا ہُوا - اس کے ہاتھ چادروں کی تہوں میں پوشیدہ تھے۔ باسی لیسیا نے مجھے اوپر اٹھایا کہ ماں کا چہرہ دیکھ لوں جس پر زردی کھنڈ رہی تھی -

"میرے بھیئے! انھیں خدا حافظ کہو! اور کہو "خدا حافظ ماں! اب تمھیں ملنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔"

اس نے آرام کے لیے ذرا مجھے فرش پر کھڑا کر دیا اور ایک سرد لمبی آہ کھینچ کر اپنے جھریوں والے بوڑھے ہاتھوں کو میری بغل میں دیتے ہوئے پھر اوپر اٹھا لیا۔" اچھی طرح دیکھ لو ننھے! خوب اچھی طرح کہ جب تم بڑے سے لڑکے ہو جاؤ گے تو انھیں بھولو گے نہیں۔ بھیئے! چوم لو انھیں۔"

میں مردہ چہرہ پر جھک گیا - ابھی اس کے جامد پپوٹوں کو چھوتے بھی نہ پایا تھا کہ میں نے باسی لیسیا کے بازوؤں میں چیخنا چلانا اور تڑپنا شروع کر دیا -

معاً انتونیا پلنگ کی دوسری طرف وارد ہوئی - اس کے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے - وہ مجھے بڑھیا کے بازوؤں سے چھین کر لے گئی اور زور سے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا - وہ سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی، روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی تھی - آنکھیں سوج گئی تھیں - اس کے چہرے نے مجھے اور اداس کر دیا اور اس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر میرا دل دکھ کر رہ گیا - انتونیا کھنچی کھنچی تھی اور اس کے چہرے سے حزن و ملال کا اک عجیب اور کرخت اظہار ہو رہا تھا - ہم ایک اور کمرے میں چلے گئے - وہاں وہ ایک نیچی کرسی پر بیٹھ گئی اور مجھے گود میں لے لیا - وہ مجھے چوم رہی تھی - پیار کر رہی تھی اور زور زور سے سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی - اس نے میرے ہاتھ کو مڑوڑنا اور ساتھ ہی ہنسنا شروع کر دیا اور اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ اللہ کی پناہ! ایک عورت اسے رومال سے ہوا دینے لگی - دوسری کی آنکھیں خوفزدہ تھیں - اس نے بوتل سے نخلخہ سنگھایا اور ایک اور پانی کا گلاس لانے کے لیے دوڑ پڑی -

(۲۱)

میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ پریشان کن غم واندوہ سے میری کنپٹیاں درد کے مارے پھڑک پھڑک گئیں۔ میں تھوڑی دیر روتا اور پھر چپ ہو جاتا تھا کہ دوسروں کا رونا سنوں۔ آدھی رات کا عمل ہوگا کہ انھوں نے دروازے چوپٹ کھول دیے اور مجھے چار شمعوں کی لرزاں روشنی نظر آئی۔ میری ماں کی نعش کو کالے صندوق میں لٹا دیا گیا تھا میں چپکے سے اندر داخل ہوا اور دریچے کے تختے پر بیٹھ گیا۔ باسی لیسیا کا بھائی اور تین اور عورتیں تابوت کے گرد بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد درزی اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی انگلیوں پر تھوکتے ہوئے شمعوں کی بتیاں درست کرتا۔ جب وہ ننھا باشتیا سیاہ بتیوں کو چٹکیوں میں مروڑ کر توڑتا اور گال پھلا کر انگلیوں پر پھونکیں مارتا تو اس سے اک مسخرے کی سی شان ٹپکتی تھی۔

جب میں نے عورتوں کی باتوں پر کان دھرے تو ہولے ہولے رونا بند کر دیا۔ وہ زندہ دفن کر دیے جانے والوں کی کہانیاں اور بھوتوں کے قصے بیان کر رہی تھیں۔

(۲۲)

جب صبح نمودار ہونا شروع ہوئی تو ایک کافی لمبے قد کی عورت کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال سفید نعش کی خنکی سے ذرا نہ گھبرائی اور میری ماں کی نیم وا آنکھوں کو چوم لیا۔ لیکن اپنی آنکھوں میں آنسو نام کو بھی نہ تھا۔ اس کے بعد دو شمعوں کے درمیان دو زانو ہو گئی اور زیتون کی شاخ کو مقدس پانی میں ڈبو کر نعش پر چھڑکا۔ باسی لیسیا مجھے تلاش کرتے ہوئے آئی اور ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

"اپنی نانی کو دیکھا، بھیا!"

سو یہ تھی میری نانی۔ اس کا گھر سینتیاگو سے سات فرسخ دور پہاڑوں میں واقع تھا۔ وہاں سے خچر پر سوار ہو کر آئی ننھی خچر صحن میں بندھا ہوا تھا اور پتھروں پر سم مار رہا تھا اور سموں کے مارنے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ اس روتے دھوتے والے گھر کے خلا میں یہ آواز گونج رہی ہے۔

انتونیا نے مجھے دروازے سے پکارا "بھیّا! بھیّا"

باسی تیسیا کے کہے کے مطابق میں ہولے ہولے اس کے پاس گیا اور وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک کونے میں لے گئی۔

"یہ جو عورت ہے نا۔ یہ ہماری نانی ہے اور اب ہم اسی کے ساتھ رہیں گے"

"نانی ہے! تو پھر اس نے مجھے چوما کیوں نہیں؟"

انتونیا اس لمحے سوچ میں پڑ گئی اور آنسو پونچھ کر بولی۔

"ارے میرے بدھو بھیّا! کیا تجھے خبر نہیں کہ اسے پہلے ماں کے لیے دعا مانگنی ہے"

وہ دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔ آخر کار اٹھی اور ہماری بابت پوچھنے لگی۔ انتونیا مجھے اس کے پاس لے گئی۔ اس نے اپنے چاندی کے سے گھنگھریالے بالوں پر سیاہ ماتمی رومال لپیٹ رکھا تھا جس سے اس کی سیاہ آنکھیں اور بھی چمکیلی نظر آتی تھیں اور مجھے اس کے درشت ہاتھ کا لمس آج بھی یاد ہے جس میں پیار کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ اپنے یہاں کی بولی ٹھولی میں باتیں کرتی تھی۔

"تمھاری ماں گئی ہے مرا اور میں ہوں اب تمھاری ماں۔ تمھارے کنے اس دنیا میں اور کوئی نہیں، میں ساتھ لیتی جاؤں گی اور گھر کو بند کر دیں گے۔ عشائے ربانی کی نماز کے بعد کل چلنا ہوگا۔"

کام کر کر کے اس کے ہاتھ کھردرے ہو گئے تھے۔ انہی سے اس نے پھر میرے گال تھپتھپائے۔

(۲۳)

دوسرے روز میری نانی نے گھر میں تالا ڈالا اور ہم ناں کلی مقتے دی براں دی سوا کوچل پڑے۔ جس پہاڑی آدمی نے مجھے اپنے پیچھے خچر پر بٹھا کر لے جانا تھا میں اس کے ساتھ سوار ہو کر پہلے ہی بازار میں پہنچ گیا تھا۔ نوکر انتونیا کو بلا رہے تھے اور دروازوں کے زور زور سے بند ہونے کی آوازیں میرے کان میں آ رہی تھیں۔ اس کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ نوکر خوفزدہ بشر سے لیے دریچوں کو کھولتے تھے اور خالی کمروں میں پھر پھر کر لگا لگا کر اسے پکارتے تھے۔ گرجے کے دروازے

پر ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی - آخر اس نے اسے چھت پر پہچان لیا - وہ وہاں بے ہوش ہو گئی تھی - ہم نے پکارا تو صبح کی دھوپ میں اس نے یوں آنکھیں کھولیں گویا نیند میں برے برے خواب دیکھ چکی ہو - محافظ گرجا کوٹ پہنے بغیر آ گیا اور اس کے اترنے کے لیے ایک سیڑھی باہر لے آیا - جب ہم چل نکلے تو طالب علم برے تل غلام گردش میں نظر آیا - ہوا سے اس کا سارا بے آستین لبادہ اک طرف کو اُڑ رہا تھا - چہرے پر سیاہ پٹی باندھ رکھی تھی اور مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جہاں اس کا سر تھا وہاں اڑ گیا تھا اور کان بھی وہیں پٹی تلے مجھے وہ خون آلودہ گھاؤ نظر آ رہے ہیں -

(۲۴)

کبھی گلیسیا کا سنتیاگو دُنیا بھر کی زیارت گاہ تھا اور آج بھی اس کے بسنے والوں کی روحیں کسی معجزے کی رونمائی کے لیے ہمہ وقت چشم براہ ہیں -

میگوئل دے سیروانتیس

خُون کی کشش

موسم گرما کی ایک تپتی رات کا ذکر ہے، ایک معمر شریف النفس ہسپانوی اپنی بیوی چھوٹے لڑکے سولہ سالہ لڑکی اور خادمہ کے ساتھ تولدو میں دریا کی سیر سے لوٹ رہا تھا۔ رات درخشاں تھی اور گیارہ کا عمل تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ چونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس آسودگی کو تکان اتارنے کی خاطر برباد کر ڈالیں جو انھیں تولدو کے زیریں حصوں کے مرغزاروں میں آرام کرتے وقت نصیب ہوئی تھی۔ اس لیے خراماں خراماں بڑھتے ہی چلے آرہے تھے۔ شہر کے سرگرم عمل انصاف اور نیک طور اطوار پر بھروسہ کرتے ہوئے نیک خُو ہسپانوی اور اس کا موقر کنبہ اپنے گھر کی راہ پر گامزن تھا۔ اور کسی حادثے سے دوچار ہونے کے گمان نہ رکھتا تھا۔ حادثوں کا قاعدہ ہے کہ اطلاع کے بغیر ہی آ ٹوٹتے ہیں۔ انھیں بھی ایک ایسا سانحہ پیش آیا جس کا انھیں وہم تک نہ تھا۔ اور جس نے ان کی موجودہ خوشی کو مبدل بہ غم کر دیا اور آنے والے بہتیرے سالوں تک سوگوار بنائے رکھا۔

اس شہر میں ایک رئیس نوجوان رہتا تھا جس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ کچھ اپنی دولت، مرتبے اور بے انداز آزادی کے سبب اور کچھ آوارہ مزاج دوستوں اور عیش پسندانہ میلان کی وجہ سے ایسی ایسی حرکتوں اور فعلوں کا ارتکاب کرتا تھا جو اس کے شایانِ شان نہ تھے اور جن کے باعث وہ غنڈے کے نام سے مشہور تھا۔ یہی نوجوان جسے اس کے حسب نسب کی خاطر ہم فی الحال رودلفو کے نام سے یاد کریں گے اپنے چار دوستوں کی معیت میں جو سبھی

بے فکرے اور گستاخانہ طور پر بے باک واقع ہوئے تھے اُس پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا جس پر ہسپانوی چڑھ رہا تھا۔ دونوں گروہ دوچار ہوئے۔ بھیڑوں اور بھیڑیوں کی مڈبھیڑ اور رودلفو اور اس کے ساتھیوں نے بے حیاؤں کی دیدہ دلیری سے کام لے کر اپنے چہرے ڈھانپتے ہوئے ماں بیٹی اور خادمہ کے چہروں کے نقاب الٹ ڈالے۔

بوڑھے کی جو ہتک عزت ہوئی تو اس نے جی بھر کے انھیں اس حرکت پر زجر و توبیخ اور طعن و تشنیع کی اور وہ جواباً اور کسی زیادتی سے اجتناب کرتے ہوئے منہ چڑاتے اور ٹھٹھول اڑاتے اپنی راہ ہو لیے۔ لیکن ہسپانوی کی لڑکی لوسادیا نام کے چہرے کے غیر معمولی حسن کا نقش رودلفو کے ذہن میں اس قدر گہرا ہوتا جا رہا تھا کہ آخر وہ دل ہار بیٹھا اور اب اس کی یہی آرزو تھی کہ نتائج سے بے نیاز ہو کر اس سے اپنی سی کر گزرے۔ جب دولتمند ہاتھ کے غنی ہوں تو انہیں کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جاتا ہے جو ان کے افعالِ شنیعہ کو جائز قرار دے اور ان کی مذموم آرزوؤں کو نیک خواہشات کا نام دے کر ان کی تعریف کرے۔ چنانچہ جونہی رودلفو نے دوستوں کو اپنے خیال سے عین مین آگاہ کیا انھوں نے اسی گھڑی اس کی خوشی کی خاطر واپس لوٹ کر اسے اغوا کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس مذموم تجویز کا تصور۔ توشیق اور شراکت اور لوسادیا کا اغوا گویا یوں کہیے ایک ہی چیز تھے۔

انھوں نے رومالوں سے چہرے ڈھانپ لیے۔ تلواریں سونت لیں اور پیچھے کو چل کر چند ہی قدموں پر اُن کو جا لیا جو ان بدمعاشوں کے ہاتھوں سے مخلصی پانے پر ابھی ابھی خدا کا شکر ادا کر چکے تھے رودلفو۔ لوسادیا پر جا جھپٹا اور اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر اڑ گیا۔ اس میں نہ اتنی طاقت رہی تھی کہ مقابلہ کرتی اور نہ ہی آواز تھی کہ چیختی چلاتی، فرطِ صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی اور غش کھانے سے دیکھ نہ سکتی تھی کہ اسے کون کہاں لے جا رہا تھا۔

اس کا باپ چلایا، ماں چیخی، بھائی رویا اور خادمہ نے سر کے بال نوچ ڈالے مگر چلّانے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ چیخیں ناشنیدہ رہیں۔ آنسو ترحم پیدا نہ کر سکے۔ بالوں کا نوچنا بیکار گیا کہ

سب کچھ جائے وقوعہ کی ویرانی، رات کی خاموشی اور بد ذاتوں کے بے رحم دلوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔ وہ ان کو اتھاہ غم میں غرق چھوڑ کر آپ ہنسی خوشی سدھار گئے۔

رودلفو آرام سے اپنے گھر آگیا اور لوسادیا کے والدین اپنے یہاں پہنچ گئے ـــ پامال۔ مایوس اور لٹے پٹے وہ نابینا تھے کہ ان کی بیٹی کی آنکھیں اُن کی آنکھوں کا نور تھیں۔ وہ تنہا تھے کہ لوسادیا کی ذات ان کے لیے مرغوب اور شیریں ترین رفاقت تھی۔ پراگندہ ذہن ہو رہے تھے کہ فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ آیا حکام کو اپنی بدنصیبی کی اِطّلاع دیں یا نہ دیں اور جو دیں تو اس میں ان کی اپنی ہی بدنامی کا اشتہار تو نہیں تھا۔ بیچارے شریف النفس ہسپانوی تو تھے ہی اور شریف النفس ہسپانیوں ہی کی مانند انھیں امداد کی ضرورت تھی، لیکن وہ شکایت کرتے ہیں تو اپنی بدقسمتی کے علاوہ اور کس کے خلاف کر سکتے تھے۔ دراں ثنا عیّار و فریب کار رودلفو اس وقت تک لوسادیا کو اپنے گھر کے کمرے میں لے آیا تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے بازوؤں میں بے ہوش پڑی ہے۔ پھر بھی اس کی آنکھوں پر رومال باندھ رکھا تھا کہ جن راہوں سے آیا تھا نہ تو انھیں دیکھ سکے اور نہ اس گھر اور کمرے کو جس میں موجود تھی۔ اس کے والد حیات تھے اور انہی کے مکان میں ایک علیٰحدہ حصّہ اس کے لیے وقف تھا۔ اپنے اس حصے اور کمرے کی چابی اس کے پاس تھی۔ اس علیٰحدگی نے انھیں سب کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور یہ ایک ایسی بے احتیاطی تھی جس کا ارتکاب ان والدین سے نہیں ہوگا، جو چاہتے ہوں کہ بچے ان کی نگہداشت میں رہیں۔ لوسادیا کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی رودلفو کو جو کچھ اس سے کرنا تھا کر ڈالا کہ جوانی کی بے مہار گرمیاں شاذ شاذ کیا قطعی موقع محل اور صورتِ حال کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ بلکہ اُلٹا ان سے برانگیختہ ہو کر شعلہ بداماں ہو جاتی ہیں۔

اس کی سمجھ بوجھ کی روشنی مدھم پڑ گئی اور تاریکی میں اس نے لوسادیا کو اس کے گوہرِ گراں مایہ سے محروم کر دیا۔ عموماً ہوس کے گناہوں کے پیشِ نظر اپنی آرزو کی تکمیل

کے واحد مقصد کے سوا اور کوئی شے نہیں ہوتی - اب رودلفو کے دل میں صرف ایک ہی سوچ تھی کہ اس سے نجات حاصل کرے - وہ بے ہوش پڑی تھی - اسے سوجھا کہ اُسے اس عالم میں راہ پر ڈال آئے - وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کو ہی تھا کہ اس نے دیکھا لوسادیا کو ہوش آ رہا ہے - وہ کہہ رہی تھی :

"آہ ! میں کہاں ہوں - یہ کس طرح کا اندھیرا ہے - یہ مرے گرد و پیش کس قسم کے سائے ہیں - میں اپنی معصومیتوں کے اعراف میں ہوں یا گناہوں کے جہنم میں - یہ مجھ پر کس کا ہاتھ پڑا ہے - یہ میں پلنگ پہ کیوں ؟ یہ درد کیوں ؟ اے محترم ماں مریم - سن رہی ہو مجھے ؟ ہائے خوب سمجھی کہ میرے والدین مجھے نہیں سن سکتے اور میں دشمنوں کے ہاتھوں میں ہوں - اے کاش یہ اندھیرا ابدی ہو جائے اور میری ان آنکھوں کو کبھی بھی دن کا اجالا دیکھنا نصیب نہ ہو ! اور یہ جو بھی جگہ ہے کاش میری بے آبروئی کی قبر ثابت ہوتی کہ چپکی ڈھکی بے عزتی اُس عزت سے بہتر ہے جو لوگوں کی زبانوں پر افسانہ بن جائے - اب مجھے یاد آیا - اور کاش میں بھلائے ہی رہتی کہ کچھ عرصہ ہوا میں اپنے والدین کے ساتھ تھی - اب یاد آیا کہ مجھ پر کوئی حملہ آور ہوا تھا - اب سارا واقعہ آنکھوں کے سامنے ہے اور سمجھتی ہوں کہ لوگوں کے حق میں بہتر ہوگا جو میری شکل بھی نہ دیکھیں" - اس نے رودلفو کو پکڑ کر کہا " اے تم جو کوئی بھی مرے پاس ہو اگر تمھاری روح کسی التماس سے متاثر ہو سکتی ہے تو میری التماس ہے کہ اب جو تم نے مجھے میری نیک نامی سے محروم کر ڈالا ہے زندگی سے بھی محروم کر ڈالو - اسے فوراً ہی ختم کر ڈالو کہ عزت کے بغیر یہ بے معنی شے ہے - ظلم کی جو زدستیاں تم نے مجھے آزردہ کرنے میں روا رکھی ہیں اس رحم سے گوارا ہو جائیں گی جس کا اظہار تم مجھے قتل کرنے میں کرو گے - یوں بیک وقت تم بے درد بھی نظر آؤ گے اور دردمند بھی —

لوسادیا کی آہ و زاری سے رودلفو متعجب و پریشان تھا کہ اس کے شباب کے تجربے

میں اس قسم کی چیزیں کم ہی آئی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے اور کہے۔ لوسادیا اس کی خاموشی سے اور متحیر ہو رہی تھی اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کے پہلو میں بھوت تھا یا سایہ۔ اس نے ہاتھ بڑھائے۔ جب اسے محسوس ہُوا کہ اس نے انسانی جسم کو چھُوا ہے اسے اس کی وہ قوت بھی یاد آگئی جس سے وہ اپنے ماں باپ کے پہلو سے جھپٹ کر جُدا کر دی گئی تھی۔ اسے اپنی بدقسمتی کا پورا پورا اندازہ ہو گیا۔ اس نے اپنی التجاؤں کو از سرِ نو سرگرم نوا کر دیا۔ جن کا تسلسل اُس کی ہچکیوں اور آہوں سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ کہنے لگی "اے بیدھڑک نوجوان! چونکہ تمھارے فعل مجھے تمھاری نوعمری کا پتا دے رہے ہیں۔ اس لیے میں تمھارے جرم کو جس کا تم نے مجھے تختۂ مشق بنایا ہے اس شرط پر معاف کرنے کو تیار ہوں کہ تم حلفیہ وعدہ کرو کہ جس طرح تم نے اس کا ارتکاب پردۂ تاریکی میں کیا ہے اسے قیامت تک پردۂ راز میں رہنے دو گے اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کرو گے۔ اتنے بڑے جرم کا میں چھوٹا سا معاوضہ مانگ رہی ہوں، لیکن میرے نزدیک یہ سب سے بڑا معاوضہ ہے جسے میں مانگ سکتی ہوں اور تم دے سکنے کے قابل ہو۔ خیال رہے کہ نہ تو میں نے تمھارا چہرہ دیکھا ہے اور نہ اس کی آرزو ہے۔ جب میرے لیے جرم کی یاد ہی کافی ہو تو مجرم کو کیوں یاد کروں؟ یا اُس کے تصور کو اپنے ذہن میں کیوں لاؤں جو میری تباہی و بربادی کا بانی مبانی ٹھہرا ہے۔ میری آہ وزاری کا علم مجھے ہے یا مرے خدا کو۔ دنیا کو کچھ پتا نہیں اور دنیا کی بلا سے کہ واقعات کس طرح ظہور پذیر ہوئے۔ ان کے متعلق اس کا فیصلہ محض اپنی رائے زنی پر منحصر ہوتا ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں ایسی قابل کیسے ہو گئی کہ ایسی ایسی باتیں تم سے اس طرح کہہ رہی ہوں۔ ایسی حقیقتیں عموماً تجربے اور عمر کا حاصل ہُوا کرتی ہیں اور میری عمر ابھی سترہ سال کی بھی نہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہُوا کہ مصائب مصیبت زدہ کو مائل فغاں بھی کر سکتے ہیں اور مائل خاموشی بھی۔ بعض اوقات وہ ان مصائب کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے کہ دوسرے یقین کر جائیں اور بعض دفعہ اس لیے انھیں سینے سے چمٹائے رکھتا ہے

کہ ان کی شدت میں کمی نہ ہو۔ بہرحال میں چپ رہوں۔ بولوں، اتنا جانتی ہوں کہ تم کو اس بات پر آمادہ کر سکتی ہوں کہ تم مجھ پر اعتبار کر دیا میری امداد کرو کہ مجھ پر عدم اعتبار کا مطلب جہالت ہوگا اور امداد سے پہلوتہی کا مطلب تمام تدابیر کو ناممکنات میں بدلنا ہوگا۔ میں اُمید کا سہارا نہیں چھوڑنا چاہتی کہ اس کے دینے میں تمھارا کچھ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ اور یہ ہے میری عرض: چونکہ تم مجھ سے یہ امید اور توقع نہیں کر سکتے کہ مرورِ وقت کے ساتھ تمھارے خلاف میرا حق بجانب غم و غصہ مدھم پڑ جائے گا اور چونکہ تمھارے دل میں میری آرزو بھی اب مر چکی ہے اور تمھیں جو کچھ مجھ سے کرنا تھا وہ بھی کر چکے ہو جس سے تمھاری بدکاری کے جذبات بھی کم ہی برانگیخت ہوں گے اس لیے جو ظلم تم نے مجھ پر توڑا ہے، اس کی سعیِ معذرت نہ کرتے ہوئے دل کو یہی سمجھاؤ کہ وہ اتفاقی بات تھی اور میں یہ سمجھوں گی کہ میں پیدا ہی نہیں ہوئی تھی اور جو ہوئی بھی تو شب و ستم سہنے کے لیے۔ مجھے فوراً ہی بازار میں یا بہتر ہو کہ گرجا گھر کے پاس لا ڈالو کہ مجھے وہاں سے اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے۔ مگر اس بات کی بھی قسم کھانی ہوگی کہ تم میرا پیچھا نہیں کرو گے۔ میری جائے رہائش کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرو گے اور نہ یہ کوشش کرو گے کہ میرے نام کا پتا کر دیا میرے والدین یا عزیز و اقارب کے ناموں کی ٹوہ لگاؤ جو صاحبان شرافت و نجابتِ نسبی کے ساتھ ساتھ کاش صاحبانِ زر بھی ہوتے تو میرے ہاتھوں یہ روزِ بد دیکھنا کاہے کو نصیب ہوتا۔ اب قسم کھاؤ اور اگر تمھیں یہ خوف ہو کہ میں تمھیں تمھاری آواز سے پہچان لوں گی تو تم جانو کہ میں نے عمر بھر میں اپنے باپ اور اعترافِ گناہ سننے والے پادری کے سوا کسی اور مرد سے بات تک نہیں کی اور چند ایک بھی ایسے نہ ہوں گے جو مجھ سے اتنی بہت دیر محوِ گفتگو رہے ہوں کہ ان کے الفاظ و آواز سے انھیں پہچان جاؤں۔"

رودلفو نے مظلوم لوسادیا کے پُرزور استدلال کا ایک ہی جواب دیا۔ اُس نے اِس

پر پھیر ہاتھ ڈالا۔ اس کی تذلیل اور اپنی عیاشی پر مہر ثبت کرنے کا ثبوت دے رہا تھا۔ جب لوسادیا نے یہ دیکھا تو اس نے اک ایسی بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ جو اس کی کم سنی سے متوقع نہیں تھی۔ ہاتھوں، پیروں، دانتوں اور بیان سے کام لیتے ہوئے اپنی مدافعت کی، وہ کہنے لگی:

"تم جو بھی ہو اے نمکحرامی خدائی خوار سنگ دل، یاد رکھ کہ جو کچھ تم نے مجھ سے حاصل کیا ہے وہ تم اک درخت یا اک جامد ٹھنٹھ سے بھی چھین جھپٹ سکتے ہو اور یہ فتح و ظفر تمھاری روسیاہی اور ذات کی دلیل ہے۔ اب جس بات کی تم کوشش کر رہے ہو وہ میری موت کے بغیر پورا ہونے سے رہی۔ جب میں بے ہوش تھی، تم مجھ پر چھا گئے اور مجھے برباد کر ڈالا، لیکن اب کہ مجھ میں قوت موجود ہے پہلے میری موت ہوگی اور پھر تمھاری فتح۔ اب اگر جاگتے دیکھتے ہوئے بھی میں تمھاری مکروہ مرضی کے آگے حیل و حجت کے بغیر جھک جاؤں تو تم خیال کرو گے کہ جس وقت تم نے مجھے تباہ کیا تھا، میری بے ہوشی مکارانہ تھی۔"

لوسادیا کی مدافعت اس قدر سخت اور جرأت مندانہ تھی کہ رودلفو کی خواہش اور قوت ٹھنڈی پڑ گئی۔ چونکہ لوسادیا کی آبروریزی کا خیال حرامکاری کی خواہش کے سوا اور کسی بات کا مرہونِ منت نہ تھا اور ایسا خیال کبھی بھی سچی محبت کا سرچشمہ نہیں ہوا کرتا۔ اب، اس کے دل میں اس عارضی خیال کی جگہ اگر ندامت، پشیمانی کا احساس نہیں تھا تو کم از کم امداد کی موہوم آرزو موجود تھی۔

رودلفو پژمردہ اور تھکا ہوا تھا۔ اک لفظ تک منہ سے نہ نکالا اور لوسادیا کو اپنے بستر اور گھر میں چھوڑتے ہوئے دروازے میں تالا ڈال دیا اور اپنے دوستوں کی تلاش میں چل نکلا کہ ان سے مشورہ کرے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

جب لوسادیا کو محسوس ہوا کہ وہ مقفل کمرے میں اکیلی ہے تو پلنگ سے اٹھی اور ادھر

اُدھر پھیرنے لگی۔ ہاتھوں سے دیواروں کو چھو رہی تھی کہ باہر جانے کا کوئی دروازہ مل جائے یا کوئی کھڑکی ہو کہ اس سے کود پڑے۔ دروازہ اسے مل تو گیا مگر بُری طرح مقفل تھا۔ اک کھڑکی بھی پالی جسے کھولا تو چاند کی روشنی اس درخشانی سے اندر آگئی کہ لوسادیا ان چیزوں کے رنگوں کو دیکھ سکتی تھی جو دیواروں سے لٹکتی ہوئی زینت آرائی کر رہی تھیں۔ اس نے پلنگ کو دیکھا جس پر سونے کا ملمع ہو رہا تھا اور اتنے ٹھاٹھ سے آراستہ تھا کہ شریف شہری کے ہونے کے بجائے کسی شہزادے کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کرسیوں اور میزوں کی گنتی کی۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ دروازہ کون سے رُخ پر ہے اور اگرچہ بہتیری تصویریں دیواروں سے آویزاں دیکھیں مگر ان کے موضوع اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ کھڑکی وسیع تھی اور اس کے تحفظ اور سجاوٹ کا کام لوہے کی بھاری جالی [illegible] تھی۔ یہ باغ میں کھلتی تھی جسے اونچی اونچی دیواروں نے گھیر رکھا تھا۔

گویا اس کے کو دکر بازار میں پہنچنے کی تدبیر ہیں اک اور رکاوٹ کھڑی تھی۔ کمرے کے سائز اور اس کے بیش قیمت آرائشی ساز و سامان سے وہ سمجھ گئی کہ اس کا مالک کوئی صاحب منصب وزر ہے اور صرف متوسط ہی نہیں بلکہ امیر آدمی ہے کھڑکی کے پاس لکھنے پڑھنے کی میز پڑی تھی، جس پر چاندی کی جیسے دار صلیب رکھی تھی اسے اس نے چوری یا خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ اک دانشمندانہ منصوبے کے ماتحت اٹھا کر اپنے جامے کی آستینوں میں چھپا لیا۔ اس کے بعد دریچہ پہلے کی طرح بند کر دیا اور پلنگ پر آکر انتظار کرنے لگی کہ دیکھیے اپنی بدقسمتی کے اس آغازِ بد کا کیا انجام ہوتا ہے۔

اس کے خیال کے مطابق ابھی ایک آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ اتنے میں دروازے کو کھلتے سنا۔ ایک شخص اس کے پاس آیا اور اس نے منہ سے اک لفظ کہے بغیر اس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا اور بازو پکڑ کر باہر لے آیا۔ ایک دفعہ اور اس کے کانوں میں دروازے کے مقفل ہونے کی آواز آئی۔ یہ شخص رودلفو تھا جو گیا تھا دوستوں کی تلاش میں مگر بعد میں ارادے کو بدل ڈالا کہ یہ

اس کے حق میں بہتر نہیں تھا کہ جو کچھ لڑکی کو پیش آیا تھا، انھیں اس کا گواہ بناتا پھرے۔ اس کے برعکس اس نے یہ ٹھان لیا کہ ان سے کہے گا کہ اپنی کرتوت سے شرمندہ ہو کر اور اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے سڑک پر چھوڑ آیا ہوں۔

اس ارادے کے پیش نظر وہ جلد لوٹ آیا کہ پو پھٹنے سے پہلے پہلے جہاں لوسادیا نے کہا تھا اسے وہیں گرجے کے پاس چھوڑ آئے۔ ورنہ دن کے اجالے میں اسے باہر نکالنا دشوار ہو جائے گا اور اسے مجبوراً لڑکی کو آئندہ شب تک اپنے کمرے میں ہی ٹھہرانا پڑ جائے گا اور اس قیام کے دوران وہ نہ تو اس سے اور متمتع ہونے کا آرزومند تھا اور نہ ہی موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے پہچان لے۔ وہ اسے 'این' نامی انتو' نامی مشہور چوک میں لے آیا۔ یہاں اس نے اک نقلی آواز نکالی اور پرتگالی اور ہسپانوی زبانوں کو مخلوط کر کے بولا۔ "اب خوف ڈر کے بغیر اپنے گھر کو جا سکتی ہو کہ کوئی تمھارا پیچھا نہیں کرے گا۔" ابھی وہ رومال کو آنکھوں سے ہٹانے بھی نہ پائی تھی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

لوسادیا تن تنہا چھوڑ دی گئی تھی۔ اس نے پٹی اتاری، جس مقام پر تھی اسے پہچان لیا اور چاروں طرف دیکھا پر کوئی نظر نہ آیا، لیکن شک یہی تھا کہ کوئی نہ کوئی دور رہتے ہوئے، اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ اس لیے اگرچہ گھر نزدیک ہی تھا ادھر کو ہر ہر قدم اٹھاتے ہوئے ٹھہر ٹھہر جاتی تھی۔ اگر کچھ جاسوس اس کا پیچھا کر بھی رہے ہوں تو ان کو گمراہ کرنے کی غرض سے وہ ایک گھر میں داخل ہو گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چند ثانیوں کے بعد اپنے گھر کو چل نکلی جہاں اس نے والدین کو حیران اور ششدر پایا۔ انھوں نے کپڑے بھی نہ اتارے تھے کہ انھیں آرام کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف دوڑے آئے اور باچشم نم سینے سے لگا لیا۔

لوسادیا سراسر خوفزدہ اور لرزاں تھی۔ وہ اپنے والدین کو ایک طرف لے گئی اور مختصر الفاظ میں تمام متعلقہ واقعات کے ساتھ اپنا تباہ کن تجربہ بیان کر دیا۔ اس نے اپنی عزت کے چور، بالجبر کرنے والے کی شناخت سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جو جو کچھ اس نے اس تھیٹر کی سٹیج پر جہاں اس کی

بدقسمتی کا المیہ کھیلا گیا تھا، دیکھا تھا وہ بھی بتایا۔ دریچہ، باغ، لوہے کی جالی، میزیں، پلنگ، دیواروں کے معلقات اور بالآخر وہ مجسمے دار صلیب بھی دکھائی جسے وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ اس مقدس مجسمے کا دیکھنا تھا کہ ان کے آنسو پھر رواں ہو گئے، وہ اپنی بدنصیبی کو رو رہے تھے۔ وہ ظالم کے لیے انتقام اور ربانی سزا کی دعا مانگ رہے تھے، وہ کہنے لگی: "مجھے تو اس بات کی خواہش نہیں ہے کہ میں معلوم کروں وہ ظالم کون تھا۔ اگر آپ اس کے متعلق جاننا بہتر سمجھیں تو یہ اس مجسمہ کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ وہ یوں کہ آپ شہر بھر کے گرجوں کے محافظوں سے منبروں پر اعلان کروا دیں کہ جو بھی متعلقہ مجسمہ کھو بیٹھے ہیں اسے اپنے منتخب پادری سے وصول کر لیں۔ اس طرح مالک کا پتا لگنے کے بعد اس دشمن کے حلیے اور خاندان کا بھی پتا چل جائے گا۔"

اس کے باپ نے جواباً کہا: "بیٹی تو نے جو کچھ کہا ہے وہ تو جیسی ٹھیک رہے گا اگر لوگوں کا نفس و سناد تیرے الفاظ کی دانشمندی کو جھٹلا نہ دے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ آج فوری طور پر یہ مجسمہ اس کمرے سے غائب ہو رہا ہو گا جس کے متعلق تم نے ابھی بیان کیا ہے اور صاحب خانہ کو بھی اس بات کا یقین ہو گا کہ اسے وہی لے گیا ہے جو اس کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ یہ مجسمہ فلاں پادری کے پاس ہے تو اس کے بجائے کہ ہم مالک کا کھوج لگائیں، اُلٹا وہی کسی اور کو مجسمے کا پورا پورا اتا پتا دیکر پادری کے پاس وصولی کے لیے بھیج دے گا اور یہ بھی معلوم کرے گا کہ پادری کو مجسمہ دینے والا کون تھا۔ یہی چال ہم بھی چل سکتے ہیں کہ کسی اور کے ذریعے مجسمے کو پادری کے حوالے کر دیں مگر اس طرح صحیح اطلاع حاصل کرنے کی بجائے اور بھی الجھاؤ میں پڑ جائیں گے۔ سو بیٹی! نہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو کہ جس طرح یہ تمھاری تذلیل کا گواہ ہے، تم سے انصاف بھی کرے گا۔ اور تم جانو میری بیٹی! کہ اعلانیہ تشہیر کا ایک تو لہ سیروں ڈھکی چھپی رسوائی سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ چونکہ تم خدا کے حضور علی الاعلان عزت سے بسر کرو گی اس لیے غم نہ کھانا کہ تم اپنی نگاہوں میں باطناً اپنی عزت لٹا چکی ہو۔ گناہ — اصل بے عزتی ہے اور نیکی — سچی عزت۔ یہ تو قول فعل

اور خیال ہی ہیں جن سے خدا ناخوش ہوتا ہے اور چونکہ تم نے اپنے قول فعل اور خیال سے اُسے ناخوش نہیں کیا۔ اس لیے اپنے آپ کو راستباز سمجھو اور میں بھی تمھیں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ایک سچے اور پیارے باپ کی طرح ہی تمھیں دیکھوں گا۔"

دانش مندی کے ان الفاظ کے ساتھ لوسادیا کے باپ نے اس کو تسلی دی۔ اور ماں نے اپنے بازو اک بار پھر اس کے گرد حمائل کر کے اپنے بس بھر تسکین بخشی جس سے اس کی آہ و زاری اور آنسوؤں کا بند پھر ٹوٹ گیا۔ اب لے دے کے وہ یہی کر سکتی تھی کہ جیسا کہتے ہیں، سر چھپائے اور شریفانہ طور پر والدین کے زیرِ سایہ شائستگی کے ساتھ غریبانہ زندگی بسر کرے۔

اس اثنا میں جب رودلفو گھر لوٹا تو مجسمے دار صلیب کو غائب پایا مگر اسے سوجھ گئی کہ لے جانا والا کون تھا۔ امیر آدمی تھا۔ ذرا بھی اہمیت نہ دی۔ تین روز بعد جب وہ اٹلی کے سفر پر تیار ہوا تو اس نے کمرے کی سب اشیا کی فہرست اپنی والدہ کی خادماؤں میں سے ایک کے سپرد کر دی۔ اس میں صلیب کا ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے والدین نے اس کے متعلق اس سے پوچھ گچھ کی۔

کئی دنوں سے رودلفو کے دل میں اٹلی جانے کی سمائی ہوئی تھی۔ اس کا باپ وہاں سے ہو آیا تھا۔ اور اس سے جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ کہتا تھا اگر کوئی رئیس زادہ اپنے یہاں ہی یوں بنا بیٹھا ہے تو وہ اصل رئیس زادہ نہیں، جب تک کہ وہ خود کو غیر ممالک میں بھی ایسا ہی ثابت نہ کر دکھائے۔ یہ ایک اور کئی اور وجوہات کی بنا پر رودلفو کا رجحانِ طبع باپ کی مرضی سے صاد تھا جس نے بارسیلونا، جینوا، روم اور نیپلز کے لیے بڑی بڑی رقموں کی ہنڈیاں اس کے حوالے کیں۔ فوجیوں کی اٹلی اور فرانس کی بھری پُری سراؤں کی باتیں اور اہلِ ہسپانیہ کی آزادی کے قصے جس سے وہ وہاں متمتع ہوئے تھے، اس کے شوق کو مہمیز ثابت ہوئے۔ وہ فوراً اپنے دو دوستوں سمیت روانہ ہو گیا۔ "آئیے نفیس آختہ مرغے۔ کبوتر کے چوزے۔ سٹور کی سبزی والی خستہ ران۔ اور گوشت بھری آنتیں کھائیے۔ آئیے!" یہ آواز

اسے پسند تھی۔ ان لذائذ کے علاوہ اسی طرح کی اور بھی اشیائے خوردنی کی ہائکیں فوجی اپنی مراجعتِ وطن پر یاد کیا کرتے تھے اور ہسپانیہ کی سراؤں اور اقامت گاہوں کی جز رسیاں اور زحمتیں انھیں تکلیف دہ محسوس ہوتی تھیں۔ بآخر وہ چل پڑا اور لوسادیا کے ساتھ جو واقع پیش آیا تھا اس کی یاد اس کے دل میں اتنی تھی کہ گویا کچھ ہُوا ہی نہیں تھا۔

ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور اُدھر لوسادیا اپنے والدین کے گھر زندگی کے دن بسر کر رہی تھی۔ حتی الامکان دور دور رہتی۔ کسی سے ملتی جلتی بھی نہیں تھی کہ مبادا کوئی اس کے بشرے سے اس کی بدقسمتی کو پڑھ لے۔ بہت مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ اسے معلوم ہوا کہ اَب تک جو کچھ اس نے اپنے ارادے سے کر رکھا تھا، وہی اُسے مجبوراً کرنا پڑے گا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ جو وہ الگ تھلگ اور چھپتی چھپاتی رہا کرتی تھی یہ اس کے حق میں مناسب رہا کہ وہ اُمید سے تھی اور نتیجتہً وہ آنسو جو کچھ عرصے سے تھمے ہوئے تھے پھر سے اس کی آنکھوں میں اُبل پڑے اور اس کی آہ وزاری نے پھر سے فضا کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ ماں کی سعی تسکین اس کے لیے لاحاصل رہی۔

وقت اڑتا گیا اور بچّے کی پیدائش کی گھڑی آ گئی۔ اس قدر رازداری سے کام لیا کہ دایہ تک نہ بلائی۔ ماں نے اس منصب کو اپنے لیے وقف کر لیا۔ لوسادیا نے چاند سے بچے کو جنم دیا۔ اتنا خوب صورت کہ اس سے بڑھ کر حسین بچہ تصور میں نہیں آ سکتا۔ جس رازداری اور حزم کو پیدائش کے وقت بروئے کار لایا گیا تھا، اسی سے پھر کام لے کر بچے کو گاؤں میں بھیج دیا۔ جب چار سال کا ہُوا تو نانا اسے اپنے گھر لے آیا اور مشہور کر دیا کہ یہ اس کا بھانجا ہے۔ اس کی تربیت اگر امیرانہ نہیں تو کم از کم دیندارانہ ضرور ہو رہی تھی۔

بچے کا نام نانا کے نام پر لُوئس رکھا گیا۔ بچّہ چہرے مہرے کا حسین۔ مزاج کا نرم۔ سمجھ کا تیز تھا۔ اس صغر سنی میں اس کے جتنے بھی کام تھے صاف گواہی دے رہے تھے کہ کسی عالی نسب باپ کا بچّہ ہے۔ بچّے کے حسن، فہم و ذکا اور طور اطوار نے نانا نانی کے دلوں میں اس

قدر محبت بھر دی کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہماری بیٹی کی بدقسمتی نے ایک رحمت کی صورت اختیار کر لی ہے جو یہ نبیرہ نصیب ہو گیا۔ جب وہ گلیوں سے گزرتا تو دعائیں اس پر نچھاور ہوتیں۔ کوئی اس کے حسن کی خاطر دعا دیتا۔ کوئی اس کی ماں کو دعا دیتا جس نے اسے جنا اور کوئی اس کے باپ کو جو اسے دنیا میں لانے کا باعث ہوا اور کوئی انھیں دعائیں دیتا جنھوں نے اس کی اتنی اچھی تربیت کی ہے۔

اپنے جاننے والوں کی تعریف و تحسین کے درمیان بچہ سات سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اس وقت تک وہ لاطینی اور ہسپانوی زبانیں پڑھ لیتا تھا اور اس کی املا صاف اور اچھی تھی۔ اس کے نانا نانی کا ارادہ تھا کہ چونکہ وہ اسے دولت مند نہیں بنا سکتے۔ عالم فاضل اور راست باز بنا دیں گے۔ گویا دانشمندی اور راستبازی ایسے خزانے نہیں ہیں جن پر نہ تو چوروں کو اور نہ ہی نام نہاد دولت کو دسترس حاصل ہو۔

ایک دن یوں ہوا کہ بچہ اپنی نانی کا پیغام کسی رشتہ دار کے ہاں لے جا رہا تھا کہ اتفاقاً اس کا گزر ایسے بازار سے ہوا جہاں گھڑ دوڑ ہو رہی تھی۔ وہ دیکھنے کو ٹھہر گیا اور بہتر جگہ حاصل کرنے کے خیال سے سڑک کے اس پار اس لمحے جانے لگا جب اس کے لیے یہ ناممکن تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی ٹھوکر سے بچ نکلے۔ سوار بھی گھوڑے کو تھام نہ سکا۔ گھوڑا اس کے اوپر سے گزر گیا اور مرا ہوا سمجھ کر بڑھ گیا۔ خون کی تلیاں سر سے بہ رہی تھیں۔ حادثے کا وقوعہ ہوا ہی ہو گا کہ اتنے میں ایک معمر رئیس جو گھوڑ دوڑ دیکھ رہا تھا اپنے گھوڑے سے کودا اور ایک ناقابلِ یقین پھرتیلے پن کے ساتھ بچے کے پاس آ رہا اور اس شخص کے بازوؤں سے لے لیا جس نے اسے اٹھا لیا تھا۔ نہ تو اس نے اپنے بڑھاپے کا خیال کیا اور نہ ہی اپنے رتبے کا جو بلند و عالی تھا۔ اور نیز قدمی سے گھر کو چل نکلا اور نوکروں کو حکم دیتا گیا کہ اس کے ساتھ نہ آئیں بلکہ جا کر کسی ڈاکٹر کو بلا لائیں جو بچے کی مرہم پٹی کرے۔ بہت سے شرفا اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور اس قدر حسین بچے کی بدقسمتی پر تاسف تھے۔

خبر پھیل گئی تھی کہ زخمی بچہ اپنے نانے کا ہم نام لی ای سی کو ہے اور کسی شریف آدمی کا بھانجا ہے۔ اس واقعہ کی خبر ایک سے دوسرے تک جو پہنچی تو شدہ شدہ اس کے نانا نانی اور پس پردہ راز ماں کے کانوں میں بھی جا پہنچی اور جب انھیں اصل حقیقت کا پتا چلا تو وہ ان لوگوں کی مانند دوڑ نکلے جو اپنے محبوب کی تلاش میں ہوش و حواس کھو بیٹھے ہوں۔ چونکہ جو رئیس بچے کو اٹھا کر لے گیا تھا، خاصا مشہور اور اہم شخص تھا اس لیے وہ جن سے بھی ملے انھوں نے جائے رہائش کا پتا بتا دیا اور وہ عین اس وقت پہنچے جب سرجن بچے کا معالجہ کر رہا تھا۔

صاحبِ خانہ اور اس کی بیگم نے ان سے جنھیں وہ بچے کے والدین سمجھتے تھے التماس کی کہ روئیں نہیں اور نہ ہی واویلا کریں کہ اس سے بچے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ لائق سرجن نے زخموں کی مرہم پٹی بڑی احتیاط اور قابلیت سے کی اور کہنے لگا "پہلے مجھے اندیشہ تھا کہ زخم کاری ہوں گے مگر کچھ ایسے کاری نہیں۔" مرہم پٹی کے دوران لڑکا کو ہوش آگیا اور اسے اپنے معزز ماموں مامی کو دیکھ کر بڑی تسکین ہوئی۔ انھوں نے باچشم نم اس کی کیفیت پوچھی۔ اس نے جواب دیا "اچھا ہوں۔ مگر بدن اور سر میں بڑا درد ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر نے حکم دیا۔ "اس سے باتیں نہ کیجیے بلکہ آرام کرنے دیجیے۔" اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بچے کے نانا نے صاحبِ خانہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس کے بھانجے سے اتنی مہربانی سے پیش آیا ہے۔ اس نے جواباً کہا۔ "شکریہ ادا کرنے کی تو کوئی بات نہیں جب میں نے دیکھا کہ گھوڑے نے بچہ دے پٹخا اور کچل ڈالا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا میری آنکھوں کے سامنے میرے اپنے اس بچے کا چہرہ آگیا ہے جو مجھے بہت محبوب ہے۔ یہ بات تھی جس نے انگیخت کیا اور میں اسے بازوؤں میں لے کر اپنے گھر اٹھا لایا۔ تندرست ہونے تک اب یہیں ٹھہرے گا اور یہاں اسے کسی چیز کی حاجت نہ رہے گی۔" اس کی بیگم اونچے گھرانے کی بی بی تھی اس نے صرف خاوند کے کہے ہی کا ساتھ نہ دیا بلکہ اور بھی بڑھ چڑھ کر تسلی آمیز الفاظ کہے۔ دونوں بزرگ ان کے مسیحی کردار سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور ماں کی تو پوچھو نہیں۔

سرجن کے الفاظ نے اس کی دکھی روح کو قدرے تسکین بخشی۔ جب اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا جہاں اس کا بچہ پڑا تھا تو بہت سی جزئیات کے ماتحت پہچان گئی کہ یہ وہی کمرہ تھا جس میں اس کی عزت کا خاتمہ اور بدقسمتی کا آغاز ہوا تھا۔ گو اس کی آراستگی اندنوں کے دلکش منظر معلقات سے نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی چیزوں کی ترتیب اور وہ ہالی دار غرفہ جو باغ میں کھلتا تھا اس کی نظر میں تھا۔ چونکہ بیمار بچے کی وجہ سے بند پڑا تھا اس نے پوچھا کہ اس کا رُخ باغ ہی کی طرف ہے تو جواب مثبت تھا۔ لیکن جو چیز اس نے سرعتاً پہچان لی وہ پلنگ تھا جو اس کا سنگِ مزار ثابت ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لکھنے پڑھنے کی میز بھی اپنی جگہ پر قائم تھی جس پر مُجسّمۂ صلیب پڑی تھی اور جسے وہ اپنے ساتھ اٹھا لے گئی تھی۔ سب سے آخر میں اس کے شبہات کی حقیقت کی تصدیق سیڑھیوں نے کر دی جن سے وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جائی گئی تھی یعنی وہی سیڑھیاں جو بازار کو جاتی تھیں اور جن کو اس نے دور اندیشانہ طور پر گن لیا تھا اور جب وہ بچے سے رخصت ہو کر اپنے گھر کو لوٹی تو پھر ان سیڑھیوں کو گنا اور تعداد کو یکساں پایا۔ اس نے کئی اور نشانیوں کو ایک دوسرے سے ملایا اور قطعی یقین ہو گیا کہ اس کے نتائج مبنی برحقیقت تھے۔ اس نے تفصیل کے ساتھ ماں کو آگاہ راز کر دیا۔ ماں نے حزم و احتیاط سے اس بات کی ٹوہ لگانی شروع کر دی کہ جن صاحب کے ہاں اس کا دودھ پڑا ہوا ہے۔ ان کے ہاں اب یا جب کوئی بیٹا بھی ہوا ہے۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ رودلفو (جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں) انہی کا بیٹا ہے اور اٹلی میں موجود ہے۔ رودلفو کے سپین سے باہر جانے کے وقت سے حساب جو لگایا تو اس کے دودھ کی عمر کے سات سال نکلے۔

اس نے ان سب باتوں کا ذکر اپنے خاوند سے کر دیا اور میاں بیوی اور بیٹی کے مابین یہی صلاح ہوئی کہ منتظر رہیں اور دیکھیں خدا زخمی بچے سے کیا کرتا ہے۔ بچہ پندرہ روز کے بعد خطرے سے باہر تھا۔ تیس دنوں کے بعد اس نے چارپائی چھوڑ دی۔ اس سارے عرصے میں اس کی ماں اور نانی اسے دیکھنے آتی رہیں اور صاحبِ خانہ اس سے یوں پیار کرتے رہے گویا وہ ان کا اپنا بیٹا

ہے ۔ اکثر اوقات ۔ دونا ایس تی فی فی آ ۔ کہ معزز آدمی کی بیوی کا نام تھا ۔ لوسادیا سے باتوں باتوں میں کہہ بھی چکی تھی ۔" اللہ! یہ بچہ میرے اپنے بچے سے جو اٹلی میں ہے ، کس قدر مشابہت رکھتا ہے اور میں جب بھی اس پر نگاہ کرتی ہوں ہمیشہ میرا اپنا بچہ میری نظروں تلے آجاتا ہے ۔"

ان باتوں سے لوسادیا کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ایک دفعہ جب وہ بیگم کے ساتھ تنہا بیٹھی تھی ۔ اس نے موقع کا فائدہ اٹھا کر چند ایسی باتیں کہہ دیں جو سوچ بچار کے بعد لوسادیا اور اس کے والدین کے درمیان طے ہوگئی تھیں ۔ وہ کم و بیش کچھ اس طرح پر تھیں ۔

" بیگم صاحبہ! جس روز میرے والدین نے سنا کہ ان کا بھانجا اس بُری طرح زخمی ہوگیا ہے تو انھیں یہی محسوس ہوا کہ آسمان نے ان سے نگاہیں پھیر لی ہیں اور اک جہانِ ستم ان پر ٹوٹ پڑا ہے ۔ انھیں معلوم ہو رہا تھا کہ اس بچے کے کھو جانے سے ان کی آنکھوں کا نور اور عمر کا سہارا چھن رہا ہے کہ وہ اس سے وہ محبت کرتے ہیں کہ اور والدین کی محبتِ اولاد بھلا ان کی محبت کا کیا مقابلہ کرے گی ۔ وہ جو کہتے ہیں ۔" جب خدا زخم دیتا ہے تو مرہم بھی بخشتا ہے ۔" تو اس بچے کی مرہم اس گھر میں مل گئی ۔ اس بچے میں چند ایسی باتوں کی یادیں دیکھ رہی ہوں جنھیں میں تا دمِ مرگ نہیں بھول سکتی اور میں معزز گھرانے کی بیٹی ہوں کہ میرے والدین عزت مند ہیں اور میرے سب آبا جد معزز ۔ اور گو بیگم صاحبہ دولت ان کے یہاں فراوانی سے نہیں تھی مگر جہاں بھی رہے عزت پر حرف نہیں آنے دیا ۔"

دونا ایس تی فی فی آ جب لوسادیا کی باتیں سنتی تھی تو اس کا دل حیرت و توصیف سے معمور ہو جاتا تھا ۔ اس کا خیال تھا اس کی عمر بیس بائیس کے لگ بھگ ہوگی اور اگرچہ سب کچھ اس کے سامنے تھا پھر بھی اسے شکل سے یقین آرہا تھا کہ کوئی اتنی چھوٹی عمر میں اس قدر دانش مند ہو سکتا ہے ۔ وہ چپ چاپ بغور سن رہی تھی اور لڑکی دل کھول کر بیان کر رہی تھی ۔

—— اس کے بیٹے کا ظالمانہ مذاق ۔ اس کی آنکھیں باندھ کر اٹھا لے جانا اور اس کمرے میں لے آنا اور نشانیوں سے پتا چلنا کہ یہی وہ کمرہ ہے جس کا اسے شک تھا اور اپنے الفاظ کی

تصدیق کے لیے اس نے سینے سے اس صلیب کو نکال لیا جسے یہاں سے اٹھا لے گئی تھی۔ اسے مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "اے خداوند خدا! تو کہ میرے جوہر عصمت کے لٹنے کا گواہ ہے۔ اب اس معاوضے کا بھی منصف ہو جیٹو جس کی میں مستحق ہوں۔ میں نے تجھے لکھنے پڑھنے کی میز سے اس لیے اٹھایا تھا کہ اس زیادتی کی یاد دہانی کراؤں جو مجھ سے روا رکھی گئی تھی۔ میں تجھ سے انتقام کی منت نہیں کرتی کہ اس چیز کی مجھے جستجو نہیں۔ لیکن تجھ سے التجا کرتی ہوں کہ مجھے اتنی تشفی بخش کہ میں اپنی بدنصیبی کو صبر سے برداشت کروں۔ یہ بچہ بیگم صاحبہ! جس پر آپ نے اتنی عنایات کی ہیں، آپ کا حقیقتاً پوتا ہے۔ یہ خدا کی مرضی تھی کہ وہ یوں گھوڑے تلے آئے اور یہاں لایا جائے اور اس کے یہاں لائے جانے میں، میری آرزو ہے کہ یہیں مجھے وہ بہترین مداوا مل جائے جو میری بدقسمتی کا نعم البدل ہو اور اگر یہ نہیں تو کم از کم کوئی ایسا چارۂ کار نصیب ہو جس کے سہارے میں اپنی بدنصیبی کو برداشت کرتی چلی جاؤں۔"

ان الفاظ کے کہتے کہتے ساتھ ہی اس نے صلیب کو سینے سے لگا لیا اور بے ہوشی کے عالم میں۔ 'دزنا ایس تی فی فی آ' کی بانہوں میں گر گئی۔ دزنا ایک عالی نسب خاتون تھی جس کے دل میں درد اور رحم بالطبع یوں جاگزین تھے جس طرح مردوں کے دلوں میں ظلم۔ اس نے ایک عالی نسب خاتون ہی کی مانند اپنے گال بے ہوش لوسادیا کے چہرے کے ساتھ پیوست کر دیئے اور آنسوؤں کا اک دریا بہا دیا جن کے ہوتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کے لیے کسی اور پانی کی ضرورت نہ رہی۔

جب وہ اس عالم میں تھیں تو اتفاقاً دزنا کا خاوند لی ای سی کو انگلی سے پکڑے اس کمرے میں آنکلا۔ بیوی کو گریہ کناں اور لوسادیا کو بیہوش دیکھ کر اس نے فوراً معاملے کی وجہ دریافت کی۔

بچہ ماں کو خالہ سمجھتا تھا اور وہ اپنی مربی دادی سے لپٹ کر پوچھنے لگا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔ بیگم نے جواب دیا۔ "باتیں بہت اہم ہیں میرے سرتاج! جو آپ کے گوش گزار ہونا

ضروری ہیں۔ مختصراً یوں عرض ہے کہ یہ لڑکی جو بے ہوش پڑی ہے آپ کی بیٹی ہے اور یہ لڑکا آپ کا پوتا۔ یہ حقیقت جو عرضِ خدمت ہے مجھے اسی بچی نے بتائی ہے اور اس کی تصدیق بچے کا چہرہ کر رہا ہے جس میں دونوں کو اپنے بیٹے کا چہرہ معلوم ہوتا ہے۔"

"بیگم! جب تک تم اور وضاحت سے کام نہ لو گی میں تمھاری بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

اس لمحے لوسادیا کو ہوش آگیا اور اس نے صلیب کو گرفت میں لے کر یوں رونا شروع کر دیا گویا لوسادیا، لوسادیا نہیں آنسوؤں کا سمندر رہے۔ اس تمام مشاہدے نے رئیس آدمی کو بھونچکا کر رکھا تھا۔ خدا کے فضل و کرم سے اس نے ان باتوں کو یوں حق الیقین سمجھا گویا بہت سی سچی گواہیوں نے اس کے سامنے ان کی تصدیق کر دی ہے۔

اس نے لوسادیا کو تسلیاں دیں۔ سینے سے لگایا، پوتے کو چوما اور اسی روز نیپلز کو خط روانہ کر دیا جس میں اس نے بیٹے کو فوراً پلٹنے کی ہدایت کی تھی۔ لکھا تھا "ہم تمھاری شادی اس عورت سے رچا رہے ہیں جس کا حسن الفاظ بیان نہیں کر سکتے اور جو قطعاً تمھارا مناسب جوڑ ہے۔"

جب لوسادیا نے اپنے بچے کے ساتھ والدین کے یہاں جانے کی اجازت چاہی تو اس نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لوسادیا کے والدین اپنی بچی کی خوش بختی پر مسرور و نازاں تھے اور خدا کا لامتناہی شکر ادا کر رہے تھے۔

خط نیپلز میں پہنچ گیا۔ رودلفو اس دلہن کو اپنانے کے لیے بے چین تھا جو اس کے باپ نے اس کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ چار جہاز ہسپانیہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور دو روز بعد ہی اپنے دو دوستوں کے ساتھ سوار ہو گیا جو لمحہ بھر کے لیے بھی اس سے جدا نہ ہوئے تھے۔ خوشگوار موسم نے بارہ روز میں انھیں بارسیلونا پہنچا دیا اور وہاں سے ڈاک گاڑی میں اور سات روز بعد تولدو پہنچ گئے۔ وہ جب اپنے والدین کے گھر داخل ہوا تو اس قدر حسین اور بانکا دکھائی دے رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا نئے فیشن کا

بلوریں مجسمہ ہے جسم رعنا سانچے میں ڈھل رہا تھا۔

اس کے والدین اپنے بیٹے کی کامل صحت اور آمد پر بے حد مسرور تھے۔

لوسادیا نے دونا ایس تی فی آ۔ کے حکم اور اشارے کے اتباع میں اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ وہ اسے جذبات اور حیرت کی نظر سے تک رہی تھی۔ رودلفو کے ساتھی اپنے گھروں کو جانے کے لیے مضطرب تھے مگر دونا نے ان کی ایک نہ سنی کہ وہ اس کے منصوبے کے لیے لابدی تھے۔

جب رودلفو پہنچا تو رات ہو رہی تھی۔ ادھر کھانا تیار ہو رہا تھا اور ادھر دونا ایس تی فی آ ان دو کو ایک طرف لے گئی۔ لوسادیا نے اسے بتا دیا تھا کہ جس رات اس کا بیٹا اسے اٹھا لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ تین اور شخص بھی تھے اور "ایس تی فی آ" کو یقین تھا کہ ان تینوں میں سے دو تو یہ ضرور ہوں گے۔ وہ ان کو ایک طرف لے جا کر بڑے خلوص سے منتیں کر کر کے پوچھنے لگی۔ "برسوں ادھر کی بات ہے میرا بیٹا ایک لڑکی فلاں رات اٹھا لایا تھا۔ کیا تمہیں یاد ہے؟ اور اگر یاد ہے تو مجھے بتاؤ کہ اس بات کی حقیقت کی آگاہی میرے خاندان اور عزیز و اقارب کی توقیر اور سکون دل کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے۔" اس نے انہیں یقین دلایا کہ واقعے کی سچائی کے اظہار سے انھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا اور اتنے موثر انداز سے منتیں کرتی چلی گئی کہ انھیں اقبال کہتے ہی بنی کہ "گرمیوں کی ایک رات کا ذکر ہے۔ ہم اور ایک اور دوست رودلفو کی معیت میں جا رہے تھے۔ جو ہم نے ایک لڑکی کو قابو کر لیا۔ رودلفو اسے اٹھا لے گیا اور ہم نے خاندان کے دوسرے افراد کو روکے رکھا جو اپنی چیخ پکار سے اسے بچانا چاہتے تھے۔ دوسرے روز رودلفو نے ہمیں بتایا کہ وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کے سوا ہمیں اور کچھ معلوم نہیں۔"

اگر اس معاملے کے متعلق اس کے دل میں کچھ شبہے تھے تو ان دو کے اعتراف نے دور کر دیئے۔

اب اس نے اپنے نیک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر لیا۔ جو یوں تھا: وہ ابھی کھانے کے لیے بیٹھنے کو ہی تھے کہ وہ رودلفو کو تنہا ایک کمرے میں لے گئی اور اس کے ہاتھوں میں ایک تصویر دے کر کہنے لگی "میرے بیٹے رودلفو! میں تمھیں تمھاری بیوی دکھا کر تمھارے شوق کی اشتہا کو تیز کروں گی۔ یہ عین ممکن ہے اس کی تصویر ہے لیکن میں مزید کہوں گی کہ وہ اپنے حسن کی کوتاہی کو اپنی نیکی سے پورا کر دے گی۔ وہ عالی نسب، محتاط اور آسودہ حال ہے اور چونکہ تمھارے والد نے اور میں نے اسے تمھارے لیے منتخب کیا ہے یقین جانو وہ تمھارے لیے موزوں ہوگی۔"

رودلفو نے تصویر کو بغور دیکھا اور کہا:

"عموماً مصور جن چہروں کی تصویریں کھینچتے ہیں ان پر حسن کی دولت لٹا دیتے ہیں۔ اگر یہاں بھی انھوں نے یہی کیا ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ جس کی یہ تصویر ہے، وہ مجسم زشت روئی ہوگی! میں ایمان سے کہتا ہوں مادرِ محترم! یہ درست و مناسب ہے کہ والدین جو حکم بھی بچوں کو دیں وہ لحاظ اسے بجا لائیں لیکن یہ بھی بہتر و مطبوع شئے ہوگی جو والدین بھی بچوں کو اس سے شادی کرنے دیں جو ان کے حسبِ پسند ہو۔ چونکہ شادی وہ گرہ ہے جسے موت ہی کھول سکتی ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس بندش کی ڈوری دونوں طرف سے برابر برابر ہو اور ایک سے دھاگوں سے بٹ رہی ہو۔ اگر مقدر ایک خاوند کو نیک، عالی نسب، محتاط اور دنیاوی ساز و سامان والی بیوی بخشے تو وہ اس کے حسبِ طبیعت تو ہوگی مگر اس کی کم روئی، مجھے ڈر ہے خاوند کی آنکھوں کو مسرت نہیں بخش سکتی۔ اگرچہ میں نوعمر ہوں لیکن اتنی بات صاف سمجھتا ہوں کہ شادی کا مقدس عہد و پیماں میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جائز اور مناسب طور پر محظوظ ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ اگر یوں نہیں تو شادی بے جان ہو جائے گی اور اپنے مقصدِ ثانی کے حصول میں ناکام۔ مجھے تو قریباً قریباً یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ آٹھوں پہر، کھاتے سوتے میں نظروں کے سامنے رہنے والا بدصورت چہرہ مسرت بخش بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

اماں! میں تمہیں تمہارے سر کا واسطہ دے کر ملتجی ہوں کہ میرے لیے ایسا ساتھی ڈھونڈنا جسے دیکھ کر مجھے کراہیت نہ ہو، خوشی ہوتا کہ پیچھے ہٹنے اور تعلقات توڑنے کے بغیر بطوع و رغبت اور ہمسری کے ساتھ اس جوئے کا بار اٹھائیں جس کے لیے خدا نے ہمیں متہم کیا ہے۔ اور جو یہ آپ نے کہا ہے کہ یہ خاتون عالی نسب باشعور اور دولت مند ہے تو اسے ایسے خاوندوں کی کمی نہ ہوگی جن کے نکتہ ہائے نظر مجھ سے مختلف ہوں۔ چند ایسے ہیں جو مرتبے کے خواہاں ہیں۔ چند سلیقہ و شعور کے متلاشی ہیں۔ چند دولت کے آرزومند ہیں اور چند حسن کے جویا اور میں آخری زمرے کا آدمی ہوں۔ خدا کا سپاس گزار ہوں اور اپنے اب و جد اور والدین کا شکر گزار کہ عالی نسبی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ رہی سلیقہ مندی تو عورت نہ تو احمق ہو اور نہ کوڑ مغز۔ اتنا ہی کافی ہے کہ وہ لوگوں کی توجہ کو اپنی حاضر جوابی سے منعطف نہ کرتی پھرے اور اتنی ہوقتی بھی نہ ہو کہ ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے والدین کا زر و مال مجھے غریب ہو جانے کی فکر و غم سے آزاد رکھے ہوئے ہے۔ یہ حسن ہی ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ حسن ہی کی مجھے آرزو ہے۔ جہیز میں شیشے پاک بازی اور سادگی کردار کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگر میری بیوی یہ کچھ لے آئے تو میں خدا کے احکام خوشی خوشی بجا لایا کروں گا اور والدین کو شاد کام بڑھاپے کا مالک بنا دوں گا۔"

اس کی رائے زنی سے رودلفو کی ماں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اس کی باتوں سے سمجھ گئی تھی کہ اس کا منصوبہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ وہ اس کی شادی اس کی خواہشات کے مطابق رچانے کی کوشش کرے گی اور اسے بیزار اور متفکر ہونے کی ضرورت نہیں کہ تصویر والی خاتون سے شادی کرنے کا جو زبردست بندوبست ہو چکا ہے وہ ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس پر رودلفو نے اپنی معنویت کا اظہار کیا اور چونکہ کھانے کا وقت ہو چکا تھا وہ اندر آ کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ جب ماں باپ، رودلفو اور اس کے ساتھی براج گئے تو "دونا ایلیس تی فی نی آ" نے یوں کہا گویا اپنی لاپرواہی کو کوس رہی ہو۔ "اف خدایا!

"میں بھی کیا مہمان داری کر رہی ہوں" اور ایک خادم سے مڑ کر کہنے لگی "فوراً جاؤ اور دونا لوسادیا سے عرض کرو کہ وہ تشریف لا کر ہمارے دسترخوان کو عزت بخشیں اور بلاپس و پیش تشریف لائیں کہ جو بھی یہاں حاضر ہیں، میرے بچے ہیں اور ان کے خادم" یہ سب کچھ منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ جس کے متعلق۔ لوسادیا کو پوری طرح آگاہ و تیار کر رکھا تھا۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد لوسادیا موجود ہو گئی۔ اس کے قدرتی حسن کو اور بھی دلربا بنایا گیا تھا اور بناؤ سنگار کی جملہ ترکیبوں سے اس میں انسانے ہو رہے تھے، سردیوں کا موسم تھا۔ اس نے سیاہ مخمل کا حلہ پہن رکھا تھا جس پر پیٹی۔ جواہرات کی زنجیر موتیوں اور سونے کے بٹن اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس کے لمبے نیم سنہری بال کنٹوپ کا کام دے رہے تھے۔ بالوں کے گھونگھر اور انھیں آراستہ کرنے والے ربن اور تابدار جواہر تماشائیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ اس کے قامت میں دلربائی تھی اور سراپا میں تمکین۔ وہ اپنے بچے کو ہاتھ سے پکڑے آئی۔ اس کے آگے آگے دو خادمائیں چاندی کے شمع دانوں میں دو موم بتیاں اٹھائے راہ میں روشنی کرتی آ رہی تھیں۔ سب اسے سلام کرنے کے لیے یوں اٹھ کھڑے ہوئے گویا وہ آسمانی مخلوق تھی جو معاً ان میں آ موجود ہوئی ہو۔ سب کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں اور اتنے مبہوت تھے کہ کسی کو بات تک کرنے کا ہوش نہ رہا۔ لوسادیا نے جمیل بشرے اور لطیف انداز سے سب کو آداب کیا اور دونا الیس تی فی نی آ نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اور رودلفو کے روبرو بٹھا لیا۔ بچے کو اپنے دادا کے پاس نشست دی گئی۔

رودلفو کی نگاہیں لوسادیا کے حسن بے نظیر پر جمی ہوئی تھیں، دل میں کہنے لگا "اگر میری ماں مرے لیے ایسی بیوی منتخب کرے جو اس سے نصف تر ہی حسین ہو تو میں اپنے آپ کو دنیا کا مسرور ترین انسان سمجھوں گا۔ اے آسمانی باپ! یہ میں اپنے سامنے کیا دیکھ رہا ہوں۔ انسانی روپ میں کوئی حور تو نہیں کیا؟"

اور یوں لوسادیا کا تصور آنکھوں کی راہ سے اس کی روح پر قابض ہو چکا تھا اور لوسادیا کھانے کے دوران میں اس شخص کو اپنے اس قدر قریب پا کر جسے وہ اپنے نور دیدہ سے بھی زیادہ چاہ رہی تھی۔ بار بار دزدیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ رودلفو پر کیا گزر رہی ہوگی۔

اگرچہ رودلفو کی ماں نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ وہی اس کا خاوند ہوگا مگر بیگم کا یقین اور اُمیدیں اسے ڈوبتی نظر آ رہی تھیں اس بات کا خوف طاری تھا کہ بیگم کے وعدے اس کی بدنصیبی کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کس قدر نازک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے کہ یا تو مسرت سے ہمکنار ہوگی یا دائمی مایوسی میں گرفتار۔ اس کے ذہن میں اندیشے اس قدر بڑھ گئے اور خیالات پر اس قدر پریشانی چھا گئی کہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پسینہ چھوٹنے لگا اور رنگ اڑنا شروع ہو گیا۔ بالآخر اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے سر کو دونا ایس تی فی نی آ کے بازوؤں میں ٹکا دیا جو اُس نے سراسیمگی کے عالم میں اس کی طرف پھیلا دیئے۔ سبھی اس کی امداد کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن سب سے زیادہ ہوائیاں جس کے چہرے پر اڑ رہی تھیں وہ رودلفو تھا۔ جو اس تک پہنچنے کی عجلت میں ٹھوکر کھا کر دو دفعہ گرا لیکن نہ تو حلق کے کھولنے سے اسے ہوش آیا نہ پانی کے چھینٹوں سے بلکہ اس کے بسلنے کا مدوجزر اور چھٹتی نبض اس کی موت کا اعلان کرتے معلوم ہوتے تھے۔ خادموں اور خادماؤں نے بدحواس ہو کر چلانا شروع کر دیا "وہ مر گئی، مر گئی۔"

دونا ایس تی فی نی آ نے لوسادیا کے والدین کو اک زیادہ مسرت بخش تقریب کے سلسلے میں کمرے میں چھپا رکھا تھا۔ جب یہ افسوسناک خبر ان کے کانوں تک پہنچی اور انھوں نے چیخ پکار کی آوازیں سنیں تو بیگم کے احکام کے علی الرغم وہ اس پادری کے سمیت لوسادیا کے کمرے میں آ پہنچے جو ان کے ساتھ موجود تھا۔ پادری دوڑ کر اس کے پاس آ گیا کہ دیکھے کہیں وہ توبہ و استغفار کا اشارہ تو نہیں کر رہی تاکہ اس کے گناہوں کا اعتراف سن لے۔ اسے خیال تھا کہ ایک ہی بے ہوش

ہوگا مگر وہاں دو بے ہوش ہو رہے تھے۔ رودلفو کی کیفیت بھی لوسادیا کی طرح دیگر تھی جس کے سینے پر اس نے اپنا منہ رکھا ہوا تھا۔ ماں نے تو اسے اس خیال سے لوسادیا کے پاس آنے دیا کہ ہونا تو اسے اسی کا ہے مگر جب اسے بھی ہوش و حواس سے محروم ہوتے دیکھا تو اس کے اپنے چھکے بھی چھوٹ ہی جانے جو رودلفو کو ہوش نہ آجاتا۔ وہ اس حد تک متاثر ہونے سے شرما رہا تھا۔

اس کی ماں یوں بولی گویا اس نے رودلفو کے خیالات پڑھ لیے ہیں: "جن جذبات کا تم نے اظہار کیا ہے۔ بیٹے! ان پر شرمندہ کیوں ہو بھلا؟ اک بات تھی جسے میں ایک خوشی کی تقریب تک ٹال رکھنا چاہتی تھی۔ اب اسے تم سے اور کیا چھپاؤں اس لیے بتائے دیتی ہوں اور ہاں اگر اسے سن کر تم شرمائے نہیں تو جب ہوگی شرمندگی کی بات۔ سو میرے عزیز از جان بیٹے، جان لو کہ یہ لڑکی جو میرے بازوؤں میں پڑی ہے۔ حقیقتاً میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تمھارے والد نے اور میں نے اسے تمھارے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ تصویر والی تو جھوٹ موٹ تھی۔"

رودلفو اپنی والہانہ اور سرگرم شوق آرزو کے ہاتھوں مجبور ہو رہا تھا اور جب خاوند کے لفظ نے ان تمام بندشوں کو دور کر دیا جو ماحول کی تہذیب اور وقار کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں تو ماں کی باتیں سنتے ہی وہ لوسادیا کے چہرے پر جھک گیا اور اپنے منہ کو اس کے منہ سے یوں پیوست کر دیا گویا منتظر ہے کہ کب اس کی روح سانس کی راہ سے آئے اور وہ اسے اپنی روح میں جذب کر لے۔

جب لوسادیا کے والدین یوں اپنے سر کے بال نوچ رہے تھے کہ چندے یہی کیفیت اور رہتی تو اک بال بھی نظر نہیں آنے کا تھا۔ جب آنسوؤں کے ساتھ ساتھ سب کا غم اور زیادہ ہو رہا تھا۔ نالہ و شیون کی آوازیں اور بلند ہو رہی تھیں۔ بچے کی چیخ پکار نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا تو اس کہرام میں لوسادیا کو ہوش آگیا اور اس ہوش کے آنے سے وہ مسرت و بہجت بھی لوٹ آئی جس نے حاضرین کے دلوں کو الوداع کہہ رکھی تھی۔

لوساویا نے جو اپنے آپ کو رودلفو کی بانہوں میں پایا تو مارے حیا کے ان سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ "نہ میری محبوب! یوں تو نہ ہونا چاہیے۔ یہ مناسب تو نہیں کہ تم اس شخص کی بانہوں سے دور ہونے کی کوشش کرو جس کی روح میں بس رہی ہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ پورے طور پر ہوش میں آ گئی۔ 'دونا ایس تی فی نی آ' نے اپنے منصوبے سے اور کام لینے کا ارادہ ترک کر دیا اور پادری سے کہا کہ فوراً اس کے بیٹے کا عقد لوساویا سے کر دے۔

پادری نے نکاح پڑھ دیا کہ جن دلوں کی یہ بات ہے متعلقہ فریقین کی رضامندی ہی کافی ہوا کرتی تھی اور آج کل کے بجا و مقدس اعلانات نکاح و شادی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ کسی دشواری کے بغیر شادی طے پا گئی۔

اس تقریب کے ختم کے بعد حاضرین باغ باغ تھے۔ لوساویا کے والدین رودلفو کو سینے سے لگا رہے تھے اور خدا کا شکر اور سمدھیوں کا شکریہ بجا لا رہے تھے۔ آپس میں دوستی کی قسمیں کھائی جا رہی تھیں اور رودلفو کے دوست متحیر تھے کہ وہ اپنی آمد آمد کی شب ہی کو غیر متوقع طور پر کس طرح پُر لطف شادی کے گواہ بن گئے تھے۔ مجھے چاہیے کہ اس منظر کی عکاسی کسی اور قلم کے سپرد کروں اور کسی اپنے سے ارفع مشاق ادیب کو اسے معرضِ تحریر میں لانے کے لیے کہوں۔ اس کے دوستوں کی حیرت اور بھی بڑھ گئی جب 'دونا ایس تی فی نی آ' نے اس امر کا اظہار برسرِ عام کر دیا کہ لوساویا ہی وہ لڑکی ہے جسے اس کا بیٹا ان کی امداد کے ساتھ اٹھا بھاگا تھا۔ رودلفو بھی اپنے دوستوں کی طرح سخت متعجب تھا۔ گو اسے یقین تھا کہ اس کے والدین اس معاملے کی خود ہی تصدیق کر چکے ہوں گے۔ پھر بھی اس نے لوساویا سے پوچھ لیا کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت یا نشانی ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "جب مجھے غشی کے پہلے دورے کے بعد ہوش آیا تو آقا! میری عزت لٹ چکی تھی اور میں نے اپنے آپ کو آپ کی انہی بانہوں میں موجود پایا تھا لیکن میں اب سمجھتی ہوں کہ اس کا کھو جانا

اچھا ہی رہا کہ غشی کے حالیہ دورے کے بعد میں پھر آپ کی بانہوں میں موجود ہوں مگر عزتِ بازیافتہ کے ساتھ! اگر یہ ثبوت ناکافی ہے تو صلیب کی نشانی آپ کو یقین دلانے کے لیے کافی ہوگی بشرطیکہ جو صلیب آپ کی والدہ محترمہ کے قبضے میں ہے وہ وہی ہے جو دوسرے روز صبح سویرے ہی گم تھی اور جسے میرے سوا وہاں سے اور کون چرا سکتا تھا۔"

"تم میری روح کی رانی ہو جو مہ و سال خدا ہمیں عطا فرمائے گا۔ ان تمام میں تمہیں اپنی روح کی رانی ہی بنائے رکھوں گا۔ میری محبوب!"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے پھر اسے سینے سے لگا لیا اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اک مینہ ان پر برس پڑا۔

دعوت ہوئی اور جن موسیقاروں کو بلایا گیا تھا، وہ بھی آ گئے۔

رودلفو اپنے بیٹے کی شکل کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ چاروں بزرگواروں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ نکلے۔ گھر کا کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا جو مسرت، شادمانی اور شگفتگی سے منوّر نہ ہو رہا ہو۔ اگرچہ رات اپنے سبک سیاہ بازوؤں کے ساتھ اڑی جا رہی تھی، لیکن رودلفو کے دل میں اپنی محبوب بیوی کی خلوت کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ اسے معلوم ہو رہا تھا رات بازوؤں کے ساتھ اڑ نہیں رہی بلکہ رینگ رہی ہے۔

جس لمحے کی آرزو تھی آخر وہ آ گیا کہ آخر ہر چیز کا آخر ہے۔ سب سونے کے لیے چلے گئے۔ گھر پر خاموشی چھا گئی لیکن اس کہانی کی حقیقت پر خاموشی نہیں چھائی کہ اس مسرور جوڑے کی عالی نسب اولاد اور بے شمار بچے جنہیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے اور جو اب بھی تولدو میں رہائش پذیر ہیں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ کہانی پر خاموشی چھا گئی ہے۔ وہ بہتیرے طویل اور مسرت سے معمور سالوں تک اپنے بچوں

اور پوتوں کے ساتھ خوش خوش زندگی بسر کرتے رہے ۔ یہ سب خدا کی مہربانی تھی اور اس خون کی کشش کی برکت جسے ان ای سی کو کے شیمیع، عالی نژاد اور پاکباز دادا نے زمین پر بہتے دیکھا تھا۔

ہین خامینز سو ہیر کا سُو

بحری نمک

کپتان جہاز کے ڈیڈ بان سے ادھر آ رہا تھا کہ چلا اٹھا "یہ کس کم بخت کے حکم سے راستے کا تختہ اوپر اُٹھ رہا ہے؟ جہاز کی دستاویزات کے بغیر ہم کیسے سفر پر جا سکتے ہیں؟" لہجے میں اک خشونت، اک تحکم تھا۔ مگر افسر اول کے متین اور معمر چہرے پر نظر پڑتے ہی سب کچھ ماند پڑ گیا۔

افسر بولا۔ "کپتان صاحب! دمکلے سے دن بھر کا کام تو لیا جا چکا ہے۔ ساری سپہ بھی مصروفیت ہی میں کٹی ہے۔ اب اگر کام کرنے والے یہ لوگ جہاز کے ملازم نہیں ہیں تو سات تیس کے بعد آپ انھیں مزید ٹھہرا نہیں سکتے۔"

دمکلے کے اوپر کے حصّے کا عظیم حجم خوفناک نظر آتا تھا۔ اس لمحے اس کے سرے پر کی تیز روشنی کے اجالے میں راستے کا تختہ۔ جہاز اور بندرگاہ کے درمیان لٹکا ہوا۔ بیحد خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

"جہنم رسید کر دا انھیں حضرت! جہاز سرمایہ داروں کی سیاحت کا کوئی سفینۂ عیش نہیں ہے۔" کپتان نے لال پیلا ہو کر لب کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ لوگ اتنے ہی ناکارہ ہیں کہ ہمارا مال ٹھکانے پر نہیں لگا سکتے تو انھیں حاضر کر دو میرے دفتر میں — مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو!"

افسر اول سایوں میں غائب ہو گیا اور ساری گودی پر خاموشی چھا گئی۔ میل آلودہ جہاز پر مزدوروں کی ہائے وہو تھم گئی تھی۔ اس کی غیر مختتم جنبش پس و پیش اتنی جانی پہچانی چیز تھی کہ ادھر دھیان نہیں جاتا تھا۔ جب دمکلے نے راستے کے تختے کو اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے جہاز اور بندرگاہ کو متحد کر دیا تو اسکی زوردار گھن گرج اور کپتان کی کرخت آواز سے چھائے ہوئے سکوت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

مجھ میں کچھ ایسی استعداد اور قابلیت تھی کہ مال کپتان کے عہدے کے لیے خاصی سفارش ثابت ہوئی۔ چنانچہ اسی حیثیت میں میں نے اپنے دوسرے بحری سفر کو بھی ختم کر لیا تھا۔ اب کچھ اچھی طرح یاد نہیں آتا کہ وہ کون سی مبہم آرزو تھی جو مجھے سمندر کی طرف کھینچ لائی۔ دور دور کے ملکوں کی سیر اور اجنبی سرزمینوں کے باسیوں سے ملنے کی آرزو تھی؟ بحری میلان تھا؟ یا ان کند ذہن اور عجمی ہم جنسوں کی لامتناہی صحبت سے بیزاری تھی جو میرے عہدِ طفولیت کا جزو لاینفک بن گئے تھے؟ ممکن ہے آخری دونوں چیزیں صحیح وجہ ٹھہریں مگر میرے نکتہ خیال سے اک اور بات زیادہ معقول وجہ ہوگی اور شاید اسی بات کو آپ بے وزن سی سمجھیں!

ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں آئینے کے سامنے بیٹھا شیو کر رہا تھا۔ مجھے خیال سا آیا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے میں مال کپتان معلوم ہو رہا ہوں۔ بیسیوں تجارت پیشہ لوگوں سے مجھے آشنائی تھی۔ وہ سبھی میری طرح غیر اہم تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں خصوصیت سے اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ معادن پر سر نہ جائیں۔ وہ اس مرنجاں مرنج اور ہم آہنگ افتادِ طبع سے متصف تھے جو کائنات کی حقیقی اور یکسانیت نواز قوت ہے! جو نفسیاتی مشترک نسب نما ہے اور انتہائی متباین اور متنوع طبیعتوں کو جنھیں ستم ظریفیٔ قدرت نے سمندر یا زمین پر یکجا کر دیا ہو، دوستی کی ہموار سطح پر لے آتی ہے۔ ہماری زبان میں ایسی طبیعتوں کے اجتماع کو جہازی ملازم کہتے ہیں۔ بہرکیف بلاشک و شبہ عرض کروں گا کہ میں پیدا ہی اس لیے ہوا تھا کہ مال کپتان بنوں۔

مگر واقعات کچھ اور ہی ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ادھر ادھر کی بھاگ دوڑ۔ لعنتوں ملامتوں کی بوچھاڑ اور چند دے تعویق کے بعد ہمارا جہاز آگے کو چل نکلا۔ ساڑھے نو بجے ڈال پارے زڈ کی روشنیاں اس کے اگلے حصے پر پڑ رہی تھیں۔ ہلکے ہلکے پیلے رنگ تھے جو جہاز کے پچھلے حصے کی زرد پٹیوں کے اوپر اوپر واضح

نظر آتے تھے۔

پیچھے سے اِک مشفقانہ ہاتھ کندھے پر رکھتے ہی کوئی خوش آئند اور طمانیت بھری آواز میں بولا۔ "اتنے گم سم کیوں ہو بیٹے؟ کسی دوست لڑکی کو تو ساحل پر نہیں چھوڑ آئے؟ نوخیز محبوبہ کی یاد میں فکرِ شعر کے لیے دنبالۂ جہاز پر رات بھر تو کھڑا نہیں رہا جا سکتا!"

مَیں نے تیزی سے گھوم کر زور سے کہا۔ "ابی فکرِ شعر! مَیں تو اپنی ہی فکر میں غرق ہوں پرسر صاحب! دن بھر کی گھٹن اور نچلی کوٹھڑی کی حبس کے بعد تازہ ہوا کی ضرورت ادھر لے آئی۔ اب بھوک بھی سخت لگ رہی ہے۔ دسترخوان بچھا نہیں اور مَیں بلاخور ہوا نہیں۔ اس کا کیا کیجیے کہ ساڑھے نو بجے تک ایک کھیل بھی منہ میں اڑ کر نہ آئے گی کہ کپتان صاحب دیدبان میں ہیں اور جہازراں مصروفِ کار! اس میں شک نہیں کہ ہم ابھی ابھی چلے ہیں۔ مگر میں تو سارا دن کام میں لگا رہا ہوں اور اب ہمیں بخشش کیا ہوئی ہے۔ اک وقفۂ آرام! جس میں انھیں کام کرتے دیکھتے جاؤ اور اس حرامی آدم خور کپتان کی ملعونانہ بے ہنگم سُرتال سنتے جاؤ جو خالی پیٹ ہضم نہ ہو اور جسے شعر و شاعری سے عاری دل قبول نہ کرے!"

"مجھے تم سے پورا پورا اتفاق ہے حضرتِ عشق باز! لیکن ہم کھانے کی میز کے گرد بیٹھے ہی تھے کہ مجھے کپتان نے تمھیں بلا بھیجنے کو نیچے بھیجا! میں تمھارے کمرے میں گیا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی اور ایک شعر و شاعری کی کتاب نشست پر کھلی پڑی تھی! میں نے تمھیں بہتیری آوازیں دیں اور کر بھی کیا سکتا تھا میں؟ آخر مجھے تمھارے محبوب مقام کا خیال آ گیا۔ یہی دنبالۂ جہاز اور یہ رہے حضرت!"

"میں عرض کر چکا ہوں کہ خاصا بیزار ہوں اور بھوک لگ رہی ہے مجھے! تو کہئے اس حرامی آدم خور سے کہ ہمیں کھانے دے یا ہمیں کھا جائے! اور کوئی ٹھٹھول نہ سمجھا اسے!"

تابدان تک پہنچتے پہنچتے پرسر احتجاجاً کہنے لگا۔ "اجی نہیں! ذرا اس کے نکتۂ خیال

کو بھی تو دیکھو! وہ تبھی گرم ہوتا ہے جب اہلِ دفتر اسے خاطر میں نہ لائیں یا جب کوئی قسمت کا مارا، چوری چھپے جہاز میں آ دیکھے اور ایسا شخص تو کپتان کے لیے مستقل کراہیت ہے، چاہو تو اس بات پر بیسد شوق شرط لگا لو! وہ دیکھو! حضرت میز کے سرے پر بیٹھے قانون بگھار رہے ہیں!"

ہم کھسک کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ افسر اول اور پرسر کپتان کے بائیں براجے تھے۔ چیف انجینئر، افسر دوم اور ڈاکٹر دائیں۔ ہم باقی کے سبھی، حسبِ مراتب میز کے آخر تک پہنچ گئے تھے!

خاموشی مسلط تھی اور میں نے افسر سوم پر نگاہ کی جو سانولی رنگت، کشادہ سینے کا نوجوان تھا۔ منفرد سا نام تھا اس کا۔ انڈر می لی اد، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے نظر چرالی ہے۔ گفتگو میں جو چپ آ پڑی تھی، میں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور شوربے کو ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا۔

معاً کپتان مڑ پڑا۔

"انڈریوز صاحب۔"

مجھے سنائی نہ دیا کہ میں میز کے آخری سرے پر بیٹھا تھا اور ذہن شوربے میں ڈوبا ہوا تھا۔ افسر سوم نے موقعے کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے کہنی ماری اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔" ارے! کپتان کچھ کہہ رہا ہے۔"

"معاف کیجیے صاحب! مجھے سنائی نہیں دیا تھا"۔۔۔ اور اپنی بے توجہی کے لیے سرزنش کا منتظر تھا۔

"انڈریوز صاحب! آپ نے پوری طرح تسلی کر لی تھی نا کہ سب اسباب ٹھیک طور پر اپنے ٹھکانے پر لگ گیا ہے۔ میں نے جہاز کی دائیں سمت خاصا الارد یکھا تھا۔"

افسر اول مداخلت کرتے ہوئے بولا" جناب! میں اس کی وجہ عرض کرتا ہوں۔ ہم نے

جہاز کی دائیں سمت کے حوضوں کو تازہ پانی سے بھر دیا ہے۔ مگر باقی ماندہ کو خالی کر کے صاف کر ڈالنے اور اس طرح الارو اقع ہُوا ہے۔"

کپتان کی آنکھیں ناراضی کی وجہ سے شعلہ ریز تھیں۔ پھر بھی اس نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اور افسرِ اوّل کے الفاظ کا تاثر معلوم کرنے کے لیے ایک ایک کے چہرے کو دیکھا۔ چیف انجینئر جذبات سے عاری تھا۔ ڈاکٹر ذرا کی ذرا سٹپٹایا سا مگر اس کی زور دار کوشش یہی رہی کہ اپنے آپ کو غیر متعلق ظاہر کرے۔ افسرِ اول کا سر ذرا اوپر کو اٹھا اور اس کی نظریں جرأت مندانہ طور پر کپتان کی نظروں سے چار ہوئیں۔ پر سر کے چہرے پر بیزاری کے آثار نہایت واضح تھے۔ ہم باقیوں کی توجہ کھانے پر مبذول رہی۔ جس میں میں سب سے پیش پیش تھا۔ اور اس بات کو ذرا الجھی خاطر میں نہ لایا کہ میری ذات ہی افسروں کی بوچھاڑ کا مرکز تھی — وہ بوچھاڑ جسے سب سامعین نے سخت بے دلی سے سننا گوارا کیا۔

کپتان نے تر شرو ہو کر کہا۔ "اینڈریوز صاحب! دھیان رکھیے کہ اگلی بندرگاہ پر سب مال ٹھیک طور پر ٹھکانے پر لگے ورنہ اس ملعون الارکے ہوتے ہوئے پلیٹوں میں شوربا بھی نہیں رہنے کا!"

یہ درست تھا کہ حوضوں کو خالی کر دیا گیا تھا۔ مگر اس میں میرا قصور؟ جانی پہچانی نظریں ایک دوسرے سے ملیں اور پر سر عیارانہ بشرہ لیے ہوئے، پانی کا بھرا ہوا گلاس جوں کا توں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔

جہاز کی روانگی سے پیشتر میں اپنے فرائض کے سرانجام دینے میں منہمک رہا اور اس دوران، اِدھر اُدھر کی باتوں کے اشارے کنائے۔ کبھی کبھار اُڑتے اُڑتے کانوں میں پڑتے رہے۔ جب ہم کُھلا سفر اختیار کیے ہوئے وال پارے زوپہنچے تو معلوم ہُوا کہ ایک لاش اندر اغلب یہی ہے کہ کسی چوری چھپے آدبکنے والے کی لاش، تازہ پانی والے حوضوں سے نکلی ہے۔ جہاز کا مال بردار انجن گرم ہونا شروع ہو گیا اور ابتدائی کاوے کاٹنے لگا۔ مال

کوٹھڑیوں کے پھاٹک کھول دیے گئے اور اسباب کمروں میں پھیلایا جانے لگا۔ اتفاقیہ اس وقت چند باتوں کی بھنک کانوں میں ایسی پڑی کہ میں متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکا۔ اس لمحے وہ باتیں مجھے تعجب ناک سی معلوم ہوئیں۔ کام کی مصروفیت کی وجہ سے میں نے ان کا خیال چھوڑ دیا مگر اب چونکہ یہ موضوع تازگی اور دلچسپی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ میری بھی دلی آرزو یہی تھی کہ کھانا ختم ہو جائے اور میں اس کے متعلق اپنے آپ کو پوری طرح آگاہ کر دوں۔ وثوق یہی تھا کہ میک لین صاحب اس سے بتمام و کمال واقف ہوں گے!

اسے اتفاق کہیے یا عمداً گھڑی گھڑائی تجویز کہ پریمر صاحب سرِ شام ہی اپنے کمرے میں متید ہو بیٹھے اور قرائن سے صاف اعلان کر دیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی کسی کے مخل ہونے کو برداشت نہیں کریں گے۔

میں عرشے پر تنہا ٹہل رہا تھا اور چوکیداروں کے سوا اور کسی سے سامنا نہ ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کے بعد انڈرمی لی اور بھاری بھر کم سرمئی رنگ مفلر میں ڈوبے ہوئے آیا اور اپنے معمول کے مطابق سر کی جنبش سے سلام کرتے ہوئے پائلٹ گھر کی طرف چلا گیا۔ جلد ہی روشنیاں بجھ گئیں اور میں اندھیرے میں کھو گیا اور تاروں بھرے گنبد کے مقابل مستولوں کی کاہلانہ حرکت کو دیکھنے لگا۔ دُور — سرے کی سفید روشنی نظر آ رہی تھی جو اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے دل بادلوں میں سے چشمک زنی کر رہی تھی۔ بادِ جنوب کے نرم روجھونکوں کے ساتھ ساتھ مال بردار جہاز کے انجر پنجر میں دھنس کر اسے رات بھر چلانے والے مٹھی بھر آدمیوں کی بے پناہ تی اور اپنی قطعی تنہائی مجھ پر اپنی آپ تنزیل الہام کی کیفیت طاری کر رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس انتہائی سکوت کو محسوس کر رہا تھا۔ جس میں ہم میں سے ہر ایک اپنے رفیقوں کے ساتھ بس رہا تھا اور ہر ایک دوسرے سے کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ بنا ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے دلوں میں انتہائی خود سری نا مقصدی اور گناہ و جرم کے لیے کوئی بیگانگی موجود نہیں!

آٹھ گھنٹوں کی آواز گونجی ۔ ہوا کے جھونکے تازہ اور شوخ و تُند ہوئے جا رہے تھے اور ان سے پناہ ڈھونڈنے کو میں اپنے کمرے میں چلا آیا ۔ میں خوابوں کے پُرسکون مامن میں بھی اس رات کی سیت کو جلد نہ بُھلا سکا ۔

کئی دنوں کے بعد میک لین صاحب سے بات کرنے کا موقع ملا لیکن میں تجسس سے گریزاں رہا کہ مال کپتانی میں تجسس کی عادت گستاخی پر محمول کی جاتی ہے ۔ لیکن ایک روز سہ پہر کو میں کٹہرے سے لگا سنگ ماہی کے کرتب دیکھ رہا تھا جو جہاز کے پیچھے پیچھے اچھلتے کودتے چلے آ رہے تھے کہ پرسر صاحب ٹہلتے ٹہلتے وہاں آ موجود ہوئے ۔ "کیسے گزر رہی ہے مال کپتان صاحب ! تو آپ نے الارکو درست کر دیا کیا ؟ نہ صاحب، اب کپتان کو حوضوں کے پانی سے کوئی شکایت نہ ہو گی آئندہ !"

"حوضوں کے پانی سے ؟" میں نے شریکِ راز بننے کی توقع کو لیے ہوئے جواب دیا ۔

"ہاں حوضوں کے پانی سے ۔" وہ کہے گیا ۔ اس کی بھویں جٹی ہوئی تھیں گویا ذہنی کرب میں مبتلا ہے ۔ "اب ان میں پانی کے سوا کچھ اور بھی ہو گا ، لیکن اُسے کیا ؟ تمہارے پاس آگ بھی ہے پانی بھی ہے ، دونوں ہی موجود ہیں ۔ تو جس سے جی چاہے کام لو ! اور اب کے ہوا بھی یہی کہ انھوں نے اس کی لاش کو بھٹی میں جلا کر راکھ کر ڈالا ۔ آہ ! اس پر کیا بیتی ہو گی !"

کوئلوں کے چند بھرپور بیلچے اور پھر مسافر تیرا اللہ بیلی !

مجھے اس فسانے پر یقین نہ آیا ۔

"میک لین صاحب ! فسانہ طرازی خوب کر لیتے ہو ! لیکن یہ ۱۹۳۶ ہے آج کل کے زمانے میں ایسی باتیں واقع نہیں ہو سکتیں ۔"

اس نے کہا اور وہ سراپا خلوص تھا ۔ "اندریاس ! اگر تمھیں یہ وہم ہے کہ ہم مہذب ہیں تو اُسے تم اس معصومیت کا شائبہ سمجھو جسے دنیا میں آنے کے وقت ساتھ لائے تھے ! تم چوبند اور ذہین نوجوان ہو اور زندگی تمھارے لیے چند خوش آئند اچنبھے لیے ہوئے

ہے، لیکن جوانی پھر جوانی ہے۔ ۲۵ کی عمر میں تمھارا ایمان تازہ ہوتا ہے۔ تم اچھوں پر اعتماد کرتے ہو اور بروں سے نفرت اور انتہائی نیک شعار لوگوں کی اتھاہ قوتِ شیطنت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔ ہمیں ماحول، خاندان، قوانین اور مقامی حالات کے بندھنوں نے جکڑ رکھا ہے۔ ذرا کسی آدمی کے بندھن ڈھیلے کر دو اور اسے ماحول سے دور لے جاؤ تو پھر تم خود دیکھ لوگے کہ اس کی ذہنیت متعین کرنے میں کس قدر دشواری پیش آتی ہے۔ ابھی تم اتنے کافی پختہ عمر نہیں ہوئے کہ دل کی تمام قوتوں کو کریڈٹ ڈالو۔ ابھی جوان ہیں۔ کپتان کیا اور میں اور تم کیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم اس حقیقت سے بغاوت کرنے کی ٹھان لیں اور میں شد و مد سے بغاوت کر بھی رہا ہوں۔ لیکن چند وہ بھی ہیں جنھیں ابھی اس سے آشنا ہونا ہے۔ مگر ایسے بھی ہیں جو پورے دوندے ہیں اور زندگی کو بروئے کار لانے میں ذرا حجاب اور نفرت محسوس نہیں کرتے! ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں انسان، انسان کا شکاری ہے اور اسے اپنے فرائض میں داخل سمجھتا ہے۔ تمھارے فرائض میں ہے کہ تم احکام جاری کرو۔ اس وقت رسّا مہیّا کرو جب کشتیاں جہاز کی بغل میں آ رہی ہوں۔ قبلہ نما کی سوئی کی درستی کرتے رہو کہ وہ صحیح طور پر شمال کی جانب رہنمائی کرے اور ہاں پھر اس قسمت کے مارے کو جلا ڈالو۔ ڈبو دو، دفن کر دو جو جہاز میں مجبوری حالات سے تنگ آ کر چوری چوری آ چھپا ہو! یہ سب کچھ فرائض میں داخل ہے اور انسان اپنا فرض ادا کرتا ہے! یہ علیحدہ بات رہی کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کے لحاظ سے آدمیوں کو پینے کے پانی میں ڈبونا قابلِ اعتراض ہے کسی نے کپتان پر اسی کا مذاق دے ٹپکا۔ حضرت وہ جنس ہیں کہ خواہ ہم ذرا سی دیر کے بعد ہی کیوں نہ بندرگاہ نظر آئیں۔ مگر جب تک اسے نظر آ نہ جائیں کبھی ہمارے لیے انتظار کرنا گوارا نہ کرے۔

"میں کپتان کو سمجھتا ہوں۔ اس بات کو تین مہینے بیت گئے ہیں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم آئی کویک سے ذرا آگے بڑھے ہی تھے کہ منہ اندھیرے اک لڑکی کو ہم نے جہاز پر سوار کرا لیا کہ جہاز رانوں نے غریب کو بے حد گالیاں دی تھیں۔ یاد ہے تمھیں وہ لڑکی؟ لیکن تمھارا وہ

پہلا سفر تھا۔ مگر وہ واقعہ تو یاد ہو گا جب ہم انتوفے گاسٹاپر جیل کے منہ میں جاتے جاتے بچ گئے تھے کہ ڈاکٹر کی سکیم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے افیم کے ڈھیر کو سمگل کرنا چاہتے تھے! جہاز کی بابت اک بات تو ضرور کہوں گا مجھیا کہ ہے یہ درسگاہ! جہاز کے سفر اسفار سے تم سیکھ بہت کچھ جاتے ہو!"

میں بیزار ہو گیا تھا۔ میرے افسر نے ضرورت سے زیادہ پی رکھی تھی۔ میں اس سے نجات حاصل کرنے کو تھا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور شراب کی بدبو سے بھرپور تنفس کو براہِ راست میرے کان پر چھوڑتے ہوئے خود اپنی وداعی نصیحت سے خلاصی حاصل کر رہا تھا۔ شرابِ کاشفِ اسرار ہوتی ہے، کہنے لگا "بیٹے یہ سمندر کی پرانی کہانی ہے اور اسے جیتے جاگتے انسان پر آزمانے کا حوصلہ نہ کر بیٹھنا!" وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور لغزیدہ لغزیدہ جنگلے تک پہنچ کر یوں سہارا لیا کہ چمنی کا خاصہ منظر نظر کے سامنے تھا۔ "دھوئیں کے دل بادل دیکھ رہے ہو، اٹھتے ہوئے! اچھا تو اب یہ سیاہ ہیں مگر جب چوری چھپے سوار ہونے والے کی انسانی لاش جل رہی ہو تو یہی دھواں — آسمانی ہو گا! صرف تمھاری آگاہی کے لیے کہا ہے میں نے اتنا!"

جب میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور اپنے آپ کو دیوار گیر شیخ خوابی نشست پر اس آرزو میں دے پٹکا کہ اپنے بے چین خیالات پر قابو پا جاؤں جو چھت والے روغن کے آرائشی نقش و نگار اور چھینٹوں کی طرح منتشر اور پریشان تھے تو عرشے پر اس کے شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے قہقہے کی گونج باقی تھی!

جب میری آنکھ کھلی تو سارا کمرہ دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ اگرچہ میں کل سہ پہر سے بستر پر دراز تھا مگر کچھ اندازہ نہ کر سکا کہ میں کتنا عرصہ محوِ خواب رہا ہوں، ممکن ہے چند گھنٹے ہی سویا ہوں۔ چونکہ مجھے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ اس لیے کپتان کو معذرت کہلا بھیجی۔ جہازی ساتھیوں کی صحبت مجھے بہت غیر مرغوب ہو گئی تھی۔ تمام رات بے حد بے چینی سے کاٹی۔ میں پڑا اضطراب

کے مارے پہلو بدل رہا تھا اور جہاز کا انجن دھک دھک مسلسل چلتا چلا جا رہا تھا۔ جہاز پس و پیش ہچکولے کھا رہا تھا اور موجیں آ آ کر اس کے پہلوؤں سے سر پھوڑ رہی تھیں۔ لے دے کر اک میں ہی تنہا تھا جو دکھ درد کے مارے ماندہ پڑا تھا اور اس کی ذمہ داری پر سرکی مدہوشانہ گفتگو پر تھی۔ کچھ عجیب سی باتیں کر رہا تھا وہ! شاید اس نے مجھے ہوش سمجھا جو یہ رات بخشی! معاً مجھے محسوس ہوا کہ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کل دوپہر سے اب تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانے پلانے کی خدمت انجام دینے کے لیے جہاز کا قسمت خانہ مرے کمرے کے سامنے تھا۔ میں نے آواز دی "خدمت گار!"

ایک راہ جاتے شخص نے اندر دیکھا۔ "اخاہ تو اندریاس ابھی تک لمبے ہی پڑے ہو۔ بھئی مال کپتان کو کیا پڑی ہے کہ کام کرے! میں ہوں آپ کا خاکسار اندرومی لی او۔"

"میں کچھ تھکا ماندہ سا تھا۔"

اس نے خوشگوار طور پر اثبات میں سر ہلایا۔

"اندرومی لی او! ذرا اندر آ کر بیٹھ نہیں جاؤ گے۔ غالباً تم نے ناشتہ نہیں کیا اور اب وقفۂ راحت بھی نصیب ہے۔ اور افسر کے لیے چند ساعتیں ہیں ہی کیا؟"

"خدمتگار! او کے لیے ناشتہ لاؤ!"

اندرومی لی او نے وہی مفلر لپیٹ رکھا تھا جسے پہنے ہوئے وہ کل رات عرشے پر بھیس بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ جب بیحد سانولے رنگ چہروں والے لوگ نڈھال ہو جائیں تو ان کے خدوخال پر اک خاکستری رنگ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی جھلک اس کے چہرے پر ہویدا تھی۔ اس کی درخشاں آنکھیں اور چہرے کی عجیب سی دلآویز کیفیت اس کے موٹے موٹے لبوں اور ہوس ناک دہن کے عیب کو چھپائے ہوئے تھی۔ وہ بیٹھ گیا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، پوچھنے لگا۔ "تو کیا یہی معلوم ہوتا ہے کہ ساری رات سویا نہیں ہوں میں؟ بہرحال کسی گناہ سے ملوث نہ سمجھیو مجھے۔"

"کیا خبر اندرومی لی او! میری تو یہی آرزو تھی کہ تمہیں اک نظر دیکھوں اور یہ دیکھوں کہ انسان

کی شکل و شباہت کیا ہوتی ہے۔ اس جہاز پر تو وہ نہیں آتے اندرومی لی او! تم مجھے شروع ہی سے پسند ہو۔ مگر تمھیں تو یاد نہیں ہوگا۔ جب میں جہاز پر آیا تھا تو تم نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا مجھے۔"

"مجھے خوب یاد ہے! برا نہ مانو گے جو کہوں کہ بڑے نوابانہ ٹھاٹھ سے آئے تھے تم! تم نے پوچھا تھا کہ نیچے بیگ کون لے جائے گا۔ میں نے سر جھکا کر سلام کیا تھا اور تمھارا بیگ اٹھا کر لے گیا تھا یہ کہتے ہوئے۔ "ادھر امیر البحر۔ حضور ادھر" اور باہر چلا آیا تھا اور پھر بیگ کے ساتھ ساتھ دو قلی بھی تمھارے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ یہ کہو یہ جہاز رانوں کی سی شان کہاں سے سیکھی تھی اختیار کرتی ہے؟"

"یہ کچھ طبعی طور پر ہو رہا تھا اندرومی لی او۔ ہم تند و تیز ابلیسانہ بادِ جنوب کے سہارے چل رہے تھے۔ میں اس رات اس قدر بیمار تھا کہ نیلیری نائم کر دی ہوگی میں نے۔"

"تم جانو جو سفرنے خدمتگار تمھارے پاس لایا تھا وہ میں نے ہی بھیجے تھے۔ جب میں تمھارے دروازے کے پاس سے گزرا تھا تو جبھی جان گیا تھا کہ تم علیل ہو۔"

"نوازش! وہ بڑے کام آئے!"

"دستک ہوئی ہے؟"

"آجائیے۔"

ایک جہاز راں آگیا۔ "ری کارڈو صاحب! پرسر صاحب کہتے ہیں کہ ہم چار بجے۔ کلاّو مقام کریں گے۔ اس لیے مہربانی کر کے کاغذات تیار رکھیے۔"

"اچھا۔ تو ان سے کہہ دو کہ کاغذات تیار ہیں۔ میں آیا کہ آیا۔ اندرومی لی او۔ اس جہاز پر یہ میرا آخری سفر ہوگا۔ ایسے لوگ کبھی دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ تمھاری جدائی مجھے محسوس ہوتی رہے گی مگر تم اسے سدھاروگے اندرومی لی او! تم اک فرشتہ نفس آدمی ہو ان شیطانوں کی صحبت میں!"

"اجی جانے دو! وہ دیکھو وہ رہا افسر اول!"

"اس نے کبھی اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے!"

"بس! یہ ایک ہی کام جانتا ہے: تابعداری۔"

"لیکن اس وقت تو نہیں ناجب ایسی باتیں وقوع پذیر ہوں جن کا ارتکاب فانی انسان کبھی گوارا بھی نہ کرے۔"

"یہ مسئلہ اس کے ضمیر سے تعلق رکھتا ہے اور کون جانے اس کا جواب ہمیں بردباری سے کام لینا چاہیے۔ مان لیا کہ کپتان دہریہ ہے اور پرسرایک مٹری شرابی یا جو کچھ بھی تم سمجھو مگر یہ تمہارے سادہ پانی والے اُن سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اب چیف انجینئر اور ڈاکٹر ہی کو لو! ایک جلاد ہے تو دوسرا کوئین کا رسیا جسے وہ سمگل کر کے جہاز میں لانے سے بھی گریز نہیں کرتا! بھلا مجھے کیا سمجھتے ہو تم!"

"اندرومی لی او! تمھیں تو خوب جانتا ہوں، میں اس بات کے ماننے سے قطعاً انکار کرتا ہوں کہ جو کچھ جہاز میں ہو رہا ہے تم اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہو!"

اندرومی لی او نے اوپر کی تختیوں پر نگاہ کی اور اس کی مسکراہٹ افسردگی میں بدل گئی۔ واقعی میرے سوالوں کی وجہ سے اس نے اک جھرجھری سی محسوس کی۔

اس نے احتجاجاً کہا۔ "اندریاس! میں جہازراں ہوں اور جہازراں کی زندگی سے تم واقف ہی ہو۔ نگہبانی کی۔ سولیا، مال اسباب کے سلسلے میں مصروف ہوئے۔ پھر سو لیا اور پھر نگہبانی! چونکہ میں تمھیں واقعی عزیز سمجھتا ہوں اس لیے اک بات بتائے دیتا ہوں، میں نے جو کچھ دیکھا ہے سو دیکھا ہے۔ مگر اپنے شبہے میں نہیں اور دوسروں کے ہاں کی باتوں میں دخل دینا میرا کام نہیں تھا کہ میں حاکم اعلیٰ نہیں، یوں بھی میرا دخل سودمند نہ ہوتا۔ گو یہ باتیں مجھے پسند نہیں تھیں مگر میں نے اپنی زبان کو تھام رکھا تھا اور اگر کوئی قدم اٹھانا بھی چاہتا تو اٹھا نہ سکتا تھا۔ اب تمھارے ہونے سے بات اور ہے۔ ہم آپس میں تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں۔ تم ذہین اور دانا ہو! تمھاری موجودگی نے مجھے اپنے انسان ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اندریاس! میں دیانت دار بھی ہوں اور معصوم بھی!"

اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور لمبی سرد آہ بھری جسے اس نے جلدی سے ضبط کر لیا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ اس کے دل سے اٹھی ہے۔

وہ بیحد مضطرب تھا۔ اچھل کھڑا ہوا اور کہنے لگا "اندریاس! بھول جاؤ ان باتوں کو! مجھے خاصی نیند کی ضرورت ہے کہ تھکا ہوا ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔ بھول جاؤ ان باتوں کو۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر میں نے روک لیا "میں تو بھلاؤں گا ہی ان باتوں کو تم بھی بھلا دینا! پر سر کی مطعون گفتگو نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میں رات بھر سو نہ سکا۔ اندرمی لی او! تم نے بھی کبھی آسمانی رنگ کا دھواں دیکھا ہے۔ توبہ توبہ! آسمان تک اس کی بو پہنچتی ہو گی! تمھاری معصومیت پر مجھے یقین ہے اب ہم متفق ہیں۔ اچھا بھائی اب جتنا عرصہ سو سکتے ہو سو لو! جاؤ، بھاگو کہ چار بجے ہم کو پیاز کی منڈی کلاؤڈ پر پڑاؤ کرنا ہے۔ تفکرات سے نجات ہو گی۔ کلاؤڈ، بہشت!"

وہ مجھ سے بغیر اٹھ کھڑا ہوا — سوچ میں ڈوبا ہوا اور بے چین۔!

آں جناب میک لین بہادر کی حاضری کے لیے میرے پاس بہت قلیل وقت تھا۔ میں نے سینے تک کپڑے اتار دیے اور کئی تنکے اندے دنوں کے بعد نصیب ہونے والے مسرت آمیز الا ہالی پن سے پانی کے چھینٹوں پر چھینٹے مارے!

"اس کمرے کو کھولنا میں نیچے مال کی بلٹی چھوڑ آیا ہوں۔"

بارہ بجے کا عمل تھا۔ ساری سہ پہر ہم جہاز پر مال اسباب لدواتے رہے۔ یہ امر ایک ہندوستانیوں کے قبیلے اور چند دوغلے لوگوں کے لیے باعث خوشنودی تھا جو ابھی تک روشنیوں کے نیچے منتخب نشستوں پر براجمان تھے۔ چکر کہنی کے پاس کام کرنے والے متواتر آٹھ گھنٹے سے مصروف کار تھے اور انھیں کوئی وقفۂ آرام نہ ملا تھا۔ جہاز پر افراتفری کا عالم تھا۔ کوئی نیچے جا رہا تھا، کوئی اوپر آ رہا تھا۔ اسباب ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا گویا اک غیر مختتم ریلا تھا۔ کمرے دھڑ تک بھر چکے تھے۔ بے شمار اور عظیم گانٹھوں اور بکسوں کی پہاڑیوں

کی گہرائیوں میں نہ جانے مجھے کتنی بار راستہ ٹٹول ٹٹول کر آنا جانا پڑا تھا۔ انھوں نے لوہے کے تنے ہوئے رسّوں کی قوت کو بُری طرح آزما ڈالا تھا، سخت اور مضبوط تختے بھی چیں کر اُٹھے تھے۔ نہ جانے مجھے کتنی بار اوپر آنا پڑا تھا۔ پیاز کی بو سے معطر! لاتعداد لکڑی کی پیٹیاں اِدھر اُدھر پڑی تھیں اور گانٹھوں اور بوریوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ نیز تک نہ لگ رہے تھے! میرے ہاتھ کالے کلوٹس ہو رہے تھے اور چہرہ گرد و غبار سے اَٹا پڑا تھا لیکن رات راحت کا پیغام لے کر آگئی! ہولے ہولے اقرا تفری مدھم پڑ گئی اور شور و غل تمام ہو گیا! ہم گجر کی آواز آنے پر چل پڑے! دیدبان سے انجن کے کمرے میں گھنٹی کے ذریعے اطلاع ہوئی اور اس آگاہی کے عمل کو نیچے دہرایا گیا۔ کل پرزے گھومنا شروع ہو گئے۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے اُن تھک ترنم کو بار دیگر اختیار کر گئے۔ سمندر سے ہوائیں آ آ کر ہماری پسینے سے معمور پیشانیوں کو فرحت بخش رہی تھیں۔ جہاز نے ہمارے پاؤں تلے ہلنا شروع کر دیا — ہم سمندر پر رواں دواں تھے!۔

جب تک مجھے خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں اپنے کاغذات کھو بیٹھا ہوں۔ انھیں ہر جگہ تلاش کیا مگر بے سود! نیچے کوٹھڑیوں کے کواڑوں کو لکڑیوں کی پیٹیوں سے بند کر دیا تھا اور ان تک رسائی کا سوال پیدا ہونا حماقت تھی۔ اب کیا کروں! صبح کے وقت رجسٹروں کی خانہ پُری ضروری تھی۔

منہ پھُلائے سوئے ہوئے جہاز رانوں نے ڈانڈوں کو اپنی بغل سے بٹایا۔ ترپال کو اٹھایا، اور کواڑ کو ذرا کھولا کہ میں سیڑھی کے ذریعے قعرِ عمیق میں اُتر جاؤں۔ ٹارچ کی مدھم لو میں بورے اور بکس بے اندازہ حجم اختیار کیے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور میں ان میں کاغذات کو تلاش کر رہا تھا۔ سمندر کی عظیم لہروں کے زبردست ریلوں نے جہاز کو جھولا بنا رکھا تھا اور اس کا ہلنا تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سمندر کے جو جید تھپیڑے جہاز کے ڈھانچے سے آ آ کر ٹکراتے تھے اگر ایک عفریت کو ان کے عادی ہونے کا حوصلہ نہیں تھا تو ان کی مہیب ٹکروں سے اس کا لرزہ براندام ہو جانا واقعی امر تھا۔ اس بلاخیز طوفان سے لوہے کے بھاری شہتیر چیں چیں اور بوجھل زنجیریں جھن جھن

کر اٹھی تھیں اور یہ آوازیں میرے کانوں میں برابر پہنچ رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ڈر گیا تھا اور مارے ڈر کے کانپ رہا تھا۔ وہ تھی کیا شے؟ اُس بوری کے پیچھے سے جس پر میں نے اپنے فراموش شدہ کاغذات کی جھلک دیکھی تھی۔ اک دبی گھٹی آواز آ رہی تھی۔ اک کھانسی کے مریض کی آواز جو کھل کر کھانس نہ سکتا ہو۔ سائیں سائیں! میرے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، سکتے کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس گھڑی گمان ہو رہا تھا کہ ایتھر کے ارتعاش کی بھی تُوہ لگا لوں گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی چیز ضرور تھی۔ اٹھ بھاگنے کی صلاح سے میں نے کاغذات جیب میں گھسیڑ لیے۔ مجھے اعوجاج سا ہو رہا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ اُٹھ بھاگوں۔ میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ مگر اس پر بھی میں بڑھے جا رہا تھا۔ میں اس چھپی ہوئی بلا کے قریب تر ہوا جاتا تھا۔ میں بوؤں اور بکسوں کے عظیم پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں یوں سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا گویا دریافت میری زندگی کا مقصدِ وحید ہو۔ اک بھولا بھٹکا بورا بکسوں کے پہلو میں چوڑا ہو کر پڑا تھا۔ اس کے نیچے پندرہ سال کا لڑکا دبک کر بیٹھا ہُوا تھا اور اپنی آزردہ اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھ کو برابر تکتا جا رہا تھا۔ انتہائی بدحالی کا نمونہ تھا۔

"رحم صاحب رحم۔ کسی کو نہ بتانا میں سچی کہوں!" اس نے میرے پاؤں پکڑ کر کہا۔

"ارے تم جہازی چور ہو!" اور یہ کہہ اسے فرش سے اٹھایا اور یوں جھنجھوڑ ڈالا کہ معیّن کرنا مشکل تھا کہ ہم دونوں میں سے مداخلت کا ذمہ دار کون ہے؟ "تمھیں خبر بھی ہے کہ تم کر کیا رہے ہو! پاگل ہو تم! جہازی چور اور پھر اس جہاز پر" میں ایک آسیب زدہ شخص کی طرح ان الفاظ کو دہراتا رہا۔ ذہن میں کسی مقصد کو لیے بغیر میں اسے کاندھوں سے پکڑ کر ہلکورے دے رہا تھا! میں حقیقت میں ہر طرح خالی الذہن تھا۔

میرے خوف کی نوعیت کا اندازہ لگائے بغیر لڑکا رحم! رحم! کے الفاظ دہرا رہا تھا۔ وہ شاید انھیں اپنی غیر متوقع دریافت پر محمول کر رہا تھا۔

"اس جہاز پر تمھارے لیے رحم کہاں بچے!" میں نے لاتعلقی کے انداز میں کہنے کی کوشش

کی "میں اتنا کر سکتا ہوں کہ جہاں ہو۔ وہیں پڑے رہو! کھانے کے لیے بھی ہے کچھ؟"

"نا ہیں صاحب! نا ہیں!"

"اچھا، کل ملوں گا تم سے! چُپ چُپ خاموش! جتن کروں گا کہ تمھیں اس مصیبت سے چھٹکارا ملے" اور میک لین صاحب اوپر سے چیخ رہے تھے "ارے اندر یاس۔ نیند آ گئی کیا ان کاغذات کے ساتھ تمھیں۔ رات وہیں بسر کرنے کی ٹھانی ہے کیا؟"

"آیا جناب آیا۔ وہ تو اک بورا ان پر آ رہا۔ اور مصیبت پڑ گئی مجھے۔"

کاغذات دفتر میں جمع کر کے فوراً ہی اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں سخت ہیجان خیز جذبات کا شکار ہو رہا تھا۔ خیال ہے کہ پرسر نے پوچھا بھی تھا کہ کہیں میں بخار میں تو مبتلا نہیں ہوں یا پاگل ہونے کے تو ارادے نہیں جب احساسات کی شدت کے ہاتھوں نڈھال ہو کر بستر پر پڑ گیا تو اک گت کی طرح میرے ہی الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونج رہے تھے "وہ تو اک بورا ان پر آ رہا! اور مصیبت پڑ گئی مجھے۔"

بورا تو واقعی ان پر آ رہا تھا مگر وہ بورا بھی کیا ہی بورا تھا!

صبح کے پانچ بج رہے ہیں! کیا یہی مقدر میں لکھا ہے کہ اس جہاز پر نیند مرے لیے حرام ہو جائے۔ خیالات کا ہجوم دماغ پر حاوی تھا۔ اس بیچارے بچے کو بچانا ہی ہو گا۔ اب اسے کھانا کیسے پہنچایا جائے؟ کواڑوں پر ترپال سے ڈھنپی ہوئی لکڑی کی پٹیاں جڑی ہیں اور انھیں کھولنے کے لیے دو آدمی درکار ہیں جس سے راز کا راز رہنا ناممکنات میں سے ہو جائے گا۔ صرف اندر می لی اوہی تھا وہ شخص جس پر میں اعتبار کر سکتا تھا جہاز کے تہ خانے والے گودام میں دروازہ ضرور ہو گا مگر ہو گا وہ بھی مقفل! پر اس کی چابی کس کے پاس ہو گی؟ خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے دن کے نکلنے کے لیے کس قدر دعائیں کیں!

بہر کیف میں خوش تھا۔ میں ایک گرانمایہ بوجھ اٹھائے ہوئے تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ میں اس بار کے قابل ہوں۔ جہاز پر میری زندگی اب تک افسردہ اور دلچسپی سے خالی تھی۔ اب اسے

اک مقصد میسر ہو گیا تھا۔ مجھ میں اُس غریب، کسمپرس مخلوق کے لیے شفقت پھوٹ پڑی تھی جو محض اس لیے اتنی بدنصیبیوں کو برداشت کرتا آیا تھا کہ اک نئی ہولناک تقدیر کے جال میں پھنس جائے! میں جہاز کو بھی جانتا تھا اور جہاز میں آنے والے واقعے کو بھی۔

آہستہ آہستہ ایک مدھم سی روشنی جہازی روشندان کے گول شیشے میں سے آنا شروع ہوئی۔ طوفانی سمندر پر بھاری بادلوں میں سے دھندلی سی پو پھٹ رہی تھی۔ ہوا تھم گئی تھی اور جب جہاز کا اگلا حصّہ تیز رو لہروں میں ابھرتا اور ڈوبتا تھا تو سیاہی مائل سطحِ آب کی تہکنیں بڑی بڑی تہوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔

چار بجنے سے پہلے ہی میں لباس پہنے تیار کھڑا تھا۔ میں عرشے پر چلا آیا۔ بادِ نسیم میری فکر آلود اور تپتی پیشانی سے کھیلتی تھی۔ جس سے مجھے اک گونہ راحت محسوس ہوتی تھی۔ پسکو کے پہاڑوں کے نیچے ساحل کا کنارہ، افق پر مشکل نظر آتا تھا۔ جہاز کے ملازم عرشے کو پانی سے دھونے میں چُپ چاپ مصروف تھے۔ میرا خیال ہے کبھی کبھی وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ کر سرگوشیاں کرتے تھے۔

اوخدایا! کیا انھیں بھی پتا چل گیا؟ مگر بدیہی طور پر یہ ممکن نہیں تھا۔

صدر ملاح کشتی میں پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ "صبح بخیر، ری کارڈو صاحب!"

"ہیلو۔ پانچو صاحب۔"

"یہ کیا کہ آپ اتنی صبح سویرے آ گئے! چوکیداروں کا کہنا ہے کہ آپ کھاٹ سے گر گئے تھے۔ دیکھیے نا وہ ہنس رہے ہیں!"

"مجھ پر ہنس رہے ہیں، پانچو صاحب؟ مجھے کچھ سر درد تھا اور اب ہوا خوری کے لیے آ نکلا ہوں۔"

"امید کہ آپ اب بہتر ہوں گے!"

"مہربانی!— بھئی پانچو صاحب؟"

"جی، ریکارڈو صاحب!"

"افسر سوم کہاں ہوں گے؟"

"اندرومی لی او صاحب؟ ابھی ابھی ہال کمرے میں گئے ہیں۔ آپ کو وہیں مل جائیں گے۔ وہ پہلے شخص ہیں جو ناشتہ کر رہے ہیں۔"

میں ایک ہی جست میں تابدان سے آ رہا۔ وہ ابھی تک روشن تھے۔ اور اندرومی لی او ایک بڑے سے گرما گرم کافی کے پیالے کے سامنے بیٹھا ہوا مراغرسانی کہانی پڑھ رہا تھا جس میں وہ قطعی کھو گیا تھا۔

میں داخل ہوا تو اس نے مجھے نظر اٹھا کر دیکھا لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں اتنی صبح سویرے کیوں آ موجود ہوا ہوں۔ وہ میری پریشان حالی کی وجہ بھی نہ تاڑ سکا۔

خوش قسمتی سے وہ ہال کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

کسی تمہید باندھنے کی کوشش کے بغیر ہی میں نے کہنا شروع کر دیا "وہی ہوا جس کی توقع تھی، سمجھ نہیں آتی کہ کیا کروں۔ میں سوچنے سے بھی عاری ہوں!"

"کس بات سے اتنا پریشان ہو رہے ہو؟ سکون اور دلجمعی سے کام لو!"

"یہاں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا میں! جس قدر جلد ممکن ہو ناشتے کو نگلنے کی کرو۔ میں کمرے میں تمہارا منتظر ہوں۔"

"ارے ہوا کیا ہے؟" اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"نہ نہ، زور سے نہ بولو۔ کمرے میں چلے آؤ!"

"دروازہ تو یقیناً ہے مگر ہے جہاز کے اگلے سرے کے بلند عرشے میں۔ اس کی چابی پانچر کے پاس ہے۔ پہلا وقت ٹھیک رہے گا اور بعدہٗ ملازمین جہاز کے ہوتے ہوئے کوئی قدم اٹھانا انھیں شک و شبہ کی گنجائش دنیا ہے۔"

"میں اسے اتنی بہت کھانے پینے کی خشک چیزیں دے دوں گا کہ سارا سفر آرام سے کٹ

جائے گا۔"

"لیکن بندۂ خدا وہاں تو وہ دم گھٹ کے مر جائے گا۔ کوئی جاندار سانس تو لے نہیں سکتا وہاں!"

اندرومی لی او کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی رگ رگ پھڑک اٹھی تھی۔ وہ سرتاپا جوش تھا۔ اس کا جوش سرکشی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

اس نے کر گزرنے کی ٹھان لی۔ وہ پھٹ پڑا۔ "اب یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تمھارے کمرے میں لے آؤں یا اپنے کمرے میں! اور بس!"

"بہتر یہی ہے کہ اسے میرے کمرے میں لے آؤ! میں لے دے کے مال کپتان ہی ہوں نا۔ میں یہ خطرہ بآسانی مول لے سکتا ہوں مگر تمھاری تو زندگی ہی برباد ہو کر رہ جائے گی!"

"اجی جہنم رسید کرو ایسی زندگی کو۔ مگر مجھے تو سارا دن عرشے پر کاٹنا پڑتا ہے اور تمھارے پاس بہتیرا وقت ہوتا ہے۔ ہاں بندرگاہ ہو تو بات اور ہے۔"

ہم دونوں سوچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے اور سوچ کو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔ "تو پھر آج رات ٹھیک رہے گی؟"

"چلو آج رات ہی سہی۔ لاؤ استاد ہاتھ!" اور اندرومی لی او نے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ مارے خوشی اور جوش کے آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ کوئی دیکھتا تو کہتا کہ جس ناگہانی چیز سے میں اس قدر خوفزدہ تھا۔ وہی اس کی روح کا چین تھی۔ اب سے پہلے میں اس کی انسانیت کی وسعت سے آشنا نہ ہوا تھا۔ اس کی دوستانہ سرگرمی شوق کو نہ جان سکا تھا جو اجڈ ظاہریت کے پردے کے نیچے فروزاں تھی اور جس نے بچے کی سی حسیت کو چھپا رکھا تھا۔ بآخر مجھے وہ شخص مل ہی گیا جو زمینی قلب سے شناسا تھا۔ جس کی روح نیکی کے لیے تڑپتی تھی! خدا اپنی برکات نازل کرے اس مصائب بھرے دن پر۔ ان لوگوں کی بیگانہ وار صحبت پر جس کے ذریعے ہمیں اپنے دو دلوں کی بھرپور اور آزادانہ ہم آہنگی اور رفاقت کی ہم نوائی کا موقع نصیب ہوا — وہ

ہم آہنگی اور رفاقت جو اب تک ساکت و خموش تھی۔ اپنے میں مگن تھی اور اپنی ہی حدوں میں مقید ہو کر رہ گئی تھی!

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دبا لیا۔

"میں جانوں تم واقعی دوست ہو!"

"بیٹھ جاؤ اور چپ رہو!"

لڑکا سہم کر سونے کی نشست کے کنارے بیٹھ گیا۔ نیچے کی کوٹھڑی کی تاریکی کے بعد یہاں کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

اس لمحے کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ دن بھر اس کی توقع رہی اور اب کہ میں اس سے دوچار تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کس طرح اسے بہاؤں! میں اس سے بے تکلفانہ پیش آنا چاہتا تھا مگر عجیب بے سرے پن سے متردد ہوتا تھا۔ میری متانت اور بے رُخی اک مال کپتان کی سی تھی جو آلوؤں یا پھلوں کی بوریوں اور بکسوں کی جانچ پڑتال کر رہا ہو!

میں نے دروازے کو ابھی مقفل کیا تھا۔ اسی سے ٹیک لگا کر اپنے نو آمد مہمان کا جائزہ لینے لگا۔ جب وہ روشنی کا عادی ہو گیا تو اس نے اپنی ناقابلِ فہم اور ترچھی آنکھوں کی نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔ اس کی انتہائی ہوشمندی اور دلچسپی سے میں گھبرا سا گیا اور اس گھبراہٹ کو چھپانے کی خاطر میں نے سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"حضور، چینی لڑکا!"

اس کے لہجے سے میں پہچان گیا کہ بیونس آئیرز کا رہنے والا ہے۔

"میرا باپ مارکوا ے زُ نامی ارجنٹائن کا تھا۔ میری ماں چینی تھی۔ جب گھر کو چھوڑا تھا تو اتنا چھوٹا تھا کہ اب یاد بھی نہیں کہ کب چھوڑا تھا۔ جب سے لوگ مجھے ترچھی آنکھوں کی وجہ سے چینی لڑکا کہتے ہیں۔"

اِک غیر مطبوع خاموشی چھا گئی۔

اپنے اطمینانِ خاطر کو پھر سے حاصل کرنے کی اُمید میں۔ میں نے سکوت توڑا "میاں چپینے، کچھ کھانا کھا لو، بے تکلفی سے رہو اور مزے سے بسم اللہ کرو! تمھیں کھائے پیئے بھی بہتیرا وقت گزرا ہوگا۔"

اس نے منہ سے اِک لفظ نہ نکالا اور میز کے پاس کھانے کو بیٹھ گیا۔ وہ اک اک لقمہ کو تول تول اور سوچ سوچ کر کھا رہا تھا۔ اس نے میری جانب پوری بے التفاتی برت رکھی تھی۔

میں پائپ سلگا کر نشست پر بیٹھ گیا اور اُس غیر معمولی تخلیق کو بنظرِ غائر دیکھنے لگا جسے تقدیر نے میرے ہاتھوں میں لا ڈالا تھا۔ میں جو عرض کر رہا ہوں کہ قسمت نے اسے میرے ہاتھوں میں لا ڈالا تو کسی ادبی صنائع بدائع کے بغیر عرض کر رہا ہوں مجھے اس سے پہلے انسانی زندگی کو کلیتاً نبٹانے کے پُرنشاط اور دہشت خیز احساس کا تجربہ نہیں ہُوا تھا۔ زندگی کہہ لیجیے یا موت، دونوں کا مجھ پر بھرپور انحصار تھا اور کون جانے یہ انحصار کتنی اَن گنت ذلتوں، مایوسیوں اور تاریکیوں پر منتج ہوا! موت بھی مرے ہاتھوں میں تھی اور زندگی اور موت کے درمیان انسانی تقدیر کے تمام مرحلے اور سلسلے بکھرے پڑتے تھے۔ جذبات کے کھولتے ہوئے سمندر۔ عریاں اور حیا سے بے نیاز۔ جذبۂ قربانی اور بے غرض محبت کے صاف شفاف چشمے — وہ بے غرض محبت جو موت سے جید ہوتے ہوئے۔ لافانی زندگی کی ضامن ہے۔

چینی لڑکا میرے شریک افتخار نہیں تھا اگر تھا بھی تو کم از کم آثار اس کے اظہار سے قاصر تھے۔ وہ بے حد محتاط ہو کر کھانا کھائے جا رہا تھا۔ اس کی نظر کبھی کبھار کسی تصویر پر جا ٹھہرتی یا کسی کتاب کے نام پر جو چھائی ہوئی پراگندگی میں بھی پڑھا جا سکتا تھا۔ وہ عجیب سا لڑکا تھا۔ سنجیدہ ہونے کے باوجود لاغرض سا تھا۔ اس کی سنجیدگی کو طفلانہ سنجیدگی کہنا پڑے گا جو سپردگی کے مترادف تھی۔ وہ کشیدہ قامت تھا اور مضبوط جسم۔ اس کے جسمانی پٹھوں کی نشوونما اپنے ہم عمروں سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس کی رنگت، زردی مائل تھی اور یہ پیلاپن

ان لوگوں میں عموماً اک طبعی بات ہے جو نہایت سرخ ہونٹوں کے مالک ہوتے ہیں۔

پہلے پہل میں نے اسے جتنا کم عمر سمجھا تھا دوشنی میں وہ اتنا کم عمر نظر نہ آتا تھا۔ سترہ کا کہوں گا یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ کا۔ جب کھانا کھا چکا تو اس نے اس شراب کی چسکی بھری جو میں نے اس کی خاطر انڈیل رکھی تھی اور پھر صبر و تحمل کے ساتھ میری طرف مڑا گویا کسی امتحان کا منتظر ہے۔

"ہیلو! چینی میاں —" میں نے دل لگی کے انداز میں کہا۔

اس کے لبوں پر وہ نورانی مسکراہٹ کھیل گئی جو مشرق کے سوا اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔

وہ میرے پیروں پر گر گیا اور ایک محبت بھرے بچے کی ادائے دلربائی کے ساتھ میرے ہاتھ کو اپنی پیشانی سے لگاتے ہوئے لبوں تک لے گیا۔ مجھ میں حیل وحجت کرنے کا حوصلہ نہ رہا۔ میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ گرم گرم آنسو میرے ناخنوں تک بہہ آئے ہیں!

عرشے پر گھنٹہ چار دفعہ گونجا۔ صبح کے دو بج رہے تھے۔

باہر سے فرحت بخش سمندر کا شور و غل سنائی دے رہا تھا۔

میں میدان میں نکل آیا تھا۔ ہم مولین ڈوپر کے کہ دو آدمیوں کو اتارنا تھا جو کے لاد پر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ دوسرا پڑاؤ اُن تو فاگا سٹا تھا جہاں ہمیں امید تھی چینے کو چوری چھپے اتار دیں گے۔ میں اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مضطرب تھا کہ اس کی موجودگی کے نتائج مجھ سے کہیں زیادہ اس کے حق میں مہلک تھے اور اندرومی لی او کو پتا بھی تو مل گئی تھی۔

چینا اپنے دن مقفل کمرے میں کاٹ رہا تھا۔ میری کتابیں پڑھتا یا نشست پر لمبے پڑے پڑے خوابوں کی وادی میں کھویا کھویا رہتا۔ اس کے بازو سر کے نیچے ہوتے تھے اور نظریں

چھت پر اس کا کرتا دھجیاں بن چکا تھا۔ نکما ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی جگہ اسے اپنا سوئیٹر دے دیا۔ ہم بہت کم باتیں کرتے تھے۔ اس کی توجہ سے بچنے کے لیے میں بہت سویرے ہی اُٹھ کر باہر آجاتا تھا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ سخت زکام میں مبتلا تھا اور مسلسل کھانستا چلا جاتا تھا۔ جب میں ہال کمرے میں یا عرشے پر ہوتا تو مجھے بھی مجبوراً کھانسنا پڑتا تھا۔ مگر اس وقت کا اندازہ لگائیے جب کوئی میری عدم موجودگی میں اسے کھانستا ہوا سنے!

ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں 'اندرومی لی او' کے ساتھ عرشے پر ٹہل رہا تھا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور اس میں جنوب کی ہئیت صاف نمایاں تھی۔

'اندرومی لی او' سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ری کارڈو! کیا ہوگا اگر ہم ان توفانگاسٹا سے گزر جائیں؟"

"یوں قاتل مسرت تو نہ بنو! وہ ٹھہرنے کی باقاعدہ بندرگاہ ہے!"

"توقع یہی ہے کہ ہم اس سے گزر جائیں۔ جہاز پانی میں بہت گہرا ڈوبا ہوا ہے۔ ناشتے کے وقت تم نے دیکھا نہیں کہ حرامی (کپتان) 'دل پارسے' زد لوٹ جانے کو کس قدر بے چین تھا۔"

میں نے نظریں بچا کر پائلاٹ بسکٹوں کو جیبوں میں ڈال لیا تھا۔ کہیں دیکھ نہ لیا ہو اس نے؟!

"اس نے تو نہیں البتہ خدمت گار نے تاڑ لیا تھا۔ جب پچھلی دفعہ تم میز سے اٹھے تھے تو اس نے تڑاخ کی آواز بھی پیدا کی تھی۔" میری نظریں چار ہونے پر اضافہ کیا۔ "بس ذرا اپنی چاک چوبندی دکھا رہا تھا وہ!"

"کہو اندرومی لی او! اگر انھیں ہمارا پتہ چل گیا تو پھر کیا ہوگا؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے! ہمیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ وہ کیا کریں گے۔ بعض باتیں تو وہ قطعاً مشتہر نہیں کیا کرتے!"

"اندرومی لی او! اب وہ ہمارا بچّہ ہے! اس کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے!"

چند لمحے اندرومی لی او خاموش رہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ای کارڈو! موت کا ہمیشہ صدمہ ہوتا ہے چاہے وہ ناواقف آدمی ہی کی کیوں نہ ہو! مگر جب تم ایک آدمی کی دیکھ بھال کرتے رہے ہو۔ جب وہ تمھارے سپرد کر دیا گیا ہو اور جب اس کی معصومیت اور ناگفتہ بہ فلاکت تمھارے دو بدو ہو تو اس کی موت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ میرا سب کچھ یہی بچّہ ہے۔" وہ دور افق پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ "میرے لیے وہ اک الہام ہے۔ اک خزینہ ہے جسے میں قائم دائم رکھوں گا۔ اک ذمہ داری ہے اک موقع ہے! میں نے زندگی بھر اور کوئی نیکی نہیں کی اور وہ اسے مجھ سے چھین نہیں سکتے! کل کی بات ہے جب تم میک لین کے پاس گئے ہوئے تھے تو اس نے مجھ سے وہ وہ باتیں کیں جو تم سے کبھی نہیں کرے گا۔ میں ذرا اُجڈ ہوں اور اسی اُجڈ پن نے اس کی حوصلہ افزائی کی! تم ہو بھی تو بے حد شائستہ نا!"

"تو بُری ٹھہری یہ بات!"

"اجی نہیں! بات یہ ہے کہ تم بہت عالم فاضل ہو۔ میں ٹھہرا عوام کا اپنا! اس لڑکے نے اپنی زندگی بندرگاہوں کے فلاکت زدہ مزدوروں کے ساتھ گزاری ہے۔ تو ایسوں کو مجھ سے عامیوں میں کچھ ایسی بات نظر آتی ہے جسے وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ دس سال کا تھا کہ اک دی ڈور کے اک لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلا۔ یہ لڑکا اس سے عمر میں کچھ بڑا تھا یہ دونوں دریائے پلیٹ سے وال پے رسے زوٗ کو جانے والے ٹارجی ین جہازیں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ چند نقرئی سکّے تھے۔ جب یہ ختم ہو گئے تو انھوں نے پیٹ بھرنے کے لیے بوٹ پالش کرنے شروع کر دیئے۔ ہے نا رومانوی چیز ہیں؟ ان کے ماں باپ قدرے آسودہ حال تھے۔ بیچارے نالوں کی مچھتوں کے نیچے سوتے رہتے تھے۔ ایک رات کو چیخنے کا ساتھی سخت دقت کے ساتھ سانس لے رہا تھا جس سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

کیا دیکھتا ہے کہ اس کی مٹھی بھنچ رہی ہے جیسے وہ بار بار زمین پر مار رہا ہے! معاً گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ہاتھ ٹھنڈا یخ تھا چینا اس ساری طویل سرد رات میں ذرا ہلا تک نہیں۔ مگر صبح کو اس کا دوست ختم ہو چکا تھا۔ دماغ کی نس پھٹنے سے موت واقع ہوئی تھی۔ چینا گماشتوں کے آس پاس بلا مقصد گھومتا رہتا تھا۔ باروں کی بندرگاہ پر کوئلے کے جہازوں کے ملاحوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔ چینا ان سے روٹی مانگ مانگ کر پیٹ بھرتا تھا۔ کبھی تو روٹی ملتی تھی اور کبھی مغلظ گالیاں۔ ایک روز اسے روٹی کی قیمت بہت مہنگی ادا کرنی پڑی۔ وہ کوئلے کے ڈھیر میں بے ہوش پڑا ہوا پایا گیا تھا اور پولیس اٹھا لے گئی تھی۔ کپڑے تار تار تھے اور خون شرمناک طور پر بہہ رہا تھا۔ خدا ایسے وحشی درندوں سے سمجھے! جب ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو چھپ چھپا کر جہاز میں سوار ہو گیا اور پیرو آ پہنچا۔ کلاؤ پر چینیوں نے اسے اپنا سمجھا اور واقعی شفقت پدرانہ سے پیش آئے۔ اس کی رگوں میں مشرقی خون دوڑ رہا تھا جس کا احساس اس میں بیدار ہو گیا تھا۔ تین سال پروین بڑے آرام سے کام کرتا رہا۔ لیکن بعد میں ایک ڈاکہ زنی کے سلسلے میں مشتبہ ٹھہرا کہ اس میں اس کے چند دوستوں کی شمولیت کا شبہ تھا اور وہ ان دوستوں کے متعلق کوئی بھی بات بتانے سے گریزاں تھا۔ وہ بے جرم ہونے کے باوجود بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ ہمارے جہاز میں آ چھپا۔"

"بڑا اچھا ہوتا جو لائما میں اسے قید کر ڈالتے!"

"لیکن وہ کسی کو مشکوک سمجھتا جب نا!"

"اس کے لیے بھی خدا کا شکر ہے ہمش۔ چپ چپ۔ وہ دیکھو پرسر!"

پرسر خوشی کی ترنگ میں تھا۔

"کیسے مزاج ہیں میک لین صاحب؟" — مجھے خیال سا گزرا کہ وہ ہمیں مشکوک سمجھتا ہے۔

"بھئی! کچھ اپنی ہی کہو۔ اچھا بتاؤ موسم پسند ہے کہ نہیں تمھیں؟ امید ہے کہ سفر کے آخر تک یہی کیفیت رہے گی! اگر تمھاری مانیں تو کسی بندرگاہ پر ٹھہریں ہی نہ۔ مگر نہیں بھائی جوانی

کو سمندر سے عشق ہے۔ ہر روز اک نئی بندرگاہ اور اک نئی حسینہ! ہیں نا؟ کیوں غلط کہا ہے کچھ ہر بندرگاہ پر اک نئی حسینہ! کیا بات ہے جوانی کی، ہا ہا، ہو ہو!"

"اَبے جناب اب.....!"

"تو گویا ظاہر یوں کرنا چاہتے ہو کہ مجھ سے متفق نہیں ہو تم او! ارے آج کل کے نوجوانو! ہم تم سے مختلف تھے ہم اعتراف کر لیا کرتے تھے بھائی۔ نہ کوئی راز تھا نہ پردہ دار! تم برخوردارو! ساری رات تو بعد الطبیعی مسائل کے سوچنے اور حل کرنے میں کاٹ دیتے ہو اور دن کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں مقید ہو کر ادبیات یا کچھ اسی طرح کی اور چیز کی تخلیق میں لگے رہتے ہو!"

میں اس زہر چکانی سے سمجھنے کو تھا کہ اندر دمی لی اور نے آنکھ مار دی!

"اوہو! اک بوڑھا شریف آدمی تو چلتا ہی چلا جائے گا۔ کیا رائے ہے تمھاری! کچھ نی آؤ نا نیچے شراب گھر میں اور وہاں جب میری نئی مرکب کو چکھو گے تو قطعاً پہچان نہ سکو گے کہ کیا چیز بن گئی ہے۔ اس جہاز میں کوئی اصلی مدھ رس یا ہے بھی تو نہیں۔ چلنی طرف کے ہمراہ میرا پیش رو اک ملازم بھی چھوڑ گیا تھا۔ کیا ہی آدمی تھا بھی مویریز! بُرا ہُوا کہ جہاز کی غرقابی سے پیشتر اس کی روح غرقاب ہو گئی مگر بہر حال اپنی بوتلیں ڈبو نہ سکا اپنے ساتھ۔ جی ہاں! حضرت! وہ تھا شرابی۔ اب تو میں کبھی کبھار صرف اک آدھ گھونٹ چڑھا لیا کرتا ہوں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ تم اس اعتدال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھو گے! اور تم صاحبو! تم بھی اعتدال کا دامن نہ چھوڑنا!" وہ بہک گیا تھا اور اس نے شراب گھر کے کٹہرے کا سہارا لے رکھا تھا، "کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں اتنی پی گیا ہوں کہ دماغ ہی چل گیا ہے! اندریاس صاحب جانتے ہیں اور میں تمھیں سے اپیل کرتا ہوں اندریاس صاحب کہ تم تائید کر دینا ذرا۔ اور ہاں! میرا حساب کتاب غلطیوں سے قطعاً مبرا ہوتا ہے۔ اس جہاز کی اک اک بوری اک اک بکس اور اک اک آلو کا حساب میرے نوک زباں ہے۔ اک اک مائی کے لال کو جانتا

ہوں جو ہزار چوری چھپے گودام کے تاریک ترین کونے کھدرے میں ہی کیوں نہ گھس آیا ہو۔ اور میں کوئی شیخی تو نہیں بگھار رہا؟" یہ کہنے کے بعد وہ خاموشی سے مڑا اور چلا گیا۔

میرے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں! اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ اسے پتہ چل گیا ہے۔ شراب گھر میرے گرد گھوم رہا تھا!

جب پرسر خدمتگار سے اُلجھ رہا تھا تو اندرومی لی او نے سرگوشی میں کہا۔" یہ بھی کوئی بات ہے بھلا زی کارڈو! پریشانی کاہے کی؟!"

اس افسردہ ناک دورِ مے نوشی کے باقی ماندہ حصے میں افسر سوم نے ہماری گفتگو بھی اپنے ذمہ لے لی۔ میں بدحواس ہو رہا تھا۔ چیف انجینئر داخل ہوا اور آتے ہی پرسر سے جہاز کے دن بھر کی مسافت پر تکرار شروع کر دی۔ ہماری عدم موجودگی کا احساس ان کی تکرار کی گرمی میں کھو گیا اور ہم وہاں سے کھسکتے بنے۔

مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اس تازہ صورتِ حال پر اندرومی لی او سے تبادلۂ خیال کروں، میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف دوڑ آیا اور دروازے میں چابی کو دو دفعہ گھما دیا۔

چینا لمبا پڑا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ اُس نے میرے آنے پر ذرا اظہارِ تحیر نہ کیا اور نہایت آرام سے آنکھیں موند لیں۔ جب میں نے اس مجسمہ سکوں کو یوں دیکھا تو میری ہمت بھی بلند ہو گئی۔ نہیں، یہ کبھی ہو نہیں سکتا! میں مہمان کی بابت افترا پردازی سے کام لے رہا ہوں شاید۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ یعنی ۱۹۳۶ء ایک ہزار نو سو چھتیس! لبِ ساحل شہر آباد ہیں۔ خوش نما باغات ہیں۔ سینما ہیں اور بازاروں میں پولس بھی ہے اور فوجی بھی! اور زمانہ ہے ایک ہزار نو سو چھتیس کا۔ یہ ہے بات! مجھے کیا ہو رہا ہے۔ آدمی کو زندہ جلا دیں گے؟ ناممکن! مجھے کسی ماہر معالج ذہنی کی ضرورت ہے اور وال پے رسے زد میں بہترے اچھے اچھے موجود ہیں۔ اسے زندہ ہی دفن کر دیں گے! خیال ہی ہولناک تھا۔ میں اسے مشتہر کر دوں گا۔ مضحکہ خیز! اسے دفن کر دیں گے!

اف خدایا۔ مگر کر ڈالیں گے وہ یہی!" میں ان آخری الفاظ کو انتہائی زور کی آواز کے ساتھ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ سارا کمرہ گونج اٹھا تھا۔ کہتے کہتے صوفے پر دھڑام سے گر پڑا۔ مجھ پر اتھاہ دل شکستگی کا عالم طاری تھا۔

جب مجھے ہوش آیا، تو صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ چینا گھٹنوں کے بل میرے پاس بیٹھا تھا اور بے چینی سے نبض ٹٹول رہا تھا، اس سے پہلے میں نے اسے کبھی اتنا رقیق القلب نہیں دیکھا تھا۔ بے نیازی شاید اسکی ادائے خاص تھی۔ وہ میری پیشانی پر گیلا تولیہ رکھ کر دباتا رہا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔" اندریاس صاحب، اندریاس صاحب، پہلے سے اچھے ہیں نا آپ۔ کسی نے دو دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ آپ میری خاطر دکھ جھیل رہے ہیں۔ آپ دکھ نہ جھیلیئے! چینا اس قابل نہیں۔ وہ ڈرپوک بھی نہیں چلی (CHILE) نے اس کے حق میں کبھی نیکی نہیں کی۔ معاف کیجیئے آپ وہاں کے تو نہیں ہیں۔ اپنی زندگی کا بُرے سے بُرا اور اچھے سے اچھا حصہ وہیں کٹا ہے۔ آپ نے کیا کہا تھا؟ قسمت؟ آپ، آپ بہت خطرے مول لے رہے ہیں۔ چینے کی پروا نہ کیجیے۔ اسے کئی دفعہ بڑی سخت سخت موت آئی ہے۔"

"ارے چینے، بس بھئی بس! تم تو مجھے پست ہمت کر رہے ہو!"

دروازے پر ہلکی سی تھپک سنائی دی۔

میں فوراً پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں، اندرومی لی او! ذرا باہر آ جاؤ تو کچھ باتیں کریں۔"

دھندلکا بڑھ رہا تھا۔ کپتان اور چیف انجینئر عرشے پر ٹہلتے ہوئے مزے مزے سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہمیں نظر انداز کر گئے۔ اندرومی لی او مجھے دنبالہ جہاز کی طرف لے گیا کہ میری ہیئت کذائی پر نظروں کا اٹھنا یقینی امر تھا۔ میرے کپڑوں کی حالت

ابتر تھی۔ میرے خدوخال سے ذہنی کرب اور تردید گی کا اظہار نمایاں تھا۔ جب ہم جہاز کے رفتار پیما سے گزر کر کٹہرے تک پہنچ گئے تو اس نے رازداری کے لہجے میں پرسر کے متعلق سنا سنایا سب دہرا دیا۔ "اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ شرابی سؤر کہانی کے ہر پیچ وخم سے بخوبی آگاہ تھا۔ کہانی اس تک پہنچی کیسے؟ اتفاقات کی چند کڑیوں کے ذریعے جن کا منبع وہ باہمی آویزش تھی جو دو روز پیشتر ان آدمیوں میں واقع ہوئی جو جہاز کے اگلے حصے پر کام کر رہے تھے۔ ایک محنت کش زخمی ہو گیا اور ڈاکٹر نے آکر اسے کلوروفارم سنگھا دیا جس کے زیر اثر وہ مسلسل ایک لڑکے کی بابت کہتا رہا جسے انھوں نے گودام میں چھپا ہوا دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے اس کی کچھ چیزیں بھی ہتھیا لی تھیں اور اور بھی ناگوار باتیں کرتا رہا جو حیران کن نہیں تھیں۔ اسی سہ پہر کو دعوتِ شرب و شراب میں ڈاکٹر نے ایک گدھے کی مانند جسے افیم کی لت کو ڑھ پر کھاج تھی نسارے راز سے پرسر کو آشنا کر ڈالا اور اک بلا آپڑی کہ بسکٹوں کا قصہ لیے ہوئے عین اس لمحے خدا ترس گار بھی ظہور پذیر ہو گیا۔ جب یہ دونوں شراب میں سرمست و سرخوش تھے اور ایسے انسانوں کے لیے ہمہ تن گوش! بسکٹ وہی تھے جنھیں میں جیب میں محفوظ کر لیتا تھا۔ دو میں دو ملائے تو بن گئے چار اور یہ رہے آپ!"

"مجھ سے چینے نے ان محنت کشوں کی آویزش کا کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"ہاں بیکار ڈو وہ تم سے ڈرتا جو ہے۔ چونکہ وہ تمھاری عزت کرتا ہے اس لیے اس نے مجھ سے تو بہت سی باتیں کر ڈالیں اور تم سے باید و شاید۔ اسی طرح یہ بات بھی تم سے چھپائے رکھی۔ اسے مجھ سے کہیں بڑھ کر تمھارا خیال رہتا ہے!"

"اندر وہی لی او! میں نیچے جا رہا ہوں کہ اس معاملے کی بابت کچھ اور بھی اس سے پتہ لگاؤں جس قدر ہمیں معلوم ہے اس سے کہیں زیادہ اور بھی موجود ہو گا۔"

"اس ہنگامے کے ہوتے ہوئے میں تمھیں چھوڑنے سے تو رہا!"۔

جب ہمیں یقین ہو گیا کہ راستے میں کوئی موجود نہیں تو ہم کمرے کو چل پڑے۔ میں نے

چابی کے لیے جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔ مگر چابی کہاں؟ میں نے ہر جگہ اس کی تلاش کی پر بے سود! پھر اندرومی لی او نے طور ڈھب سے کام لے کر دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خالی تھا۔ سرہانے کی سلوٹیں صاف کر دی گئی تھیں۔ کتابوں کو ترتیب اور سلیقے سے رکھا گیا تھا اور نم آلود تولیہ کو خشک کرنے کے لیے خانے پر پھیلا رکھا تھا۔ مگر چینا کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

"اندرومی لی او! چینا گیا!" میں نے نامرادانہ کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

اندرومی لی او نے دروازہ بند کر دیا۔ سگار سلگایا اور سامنے کی نشست پر براجمان ہو گیا۔

"ای کارڈو! تم سے ایمان کی بات کہوں کہ بہت ہی اچھا ہوا۔"

"خدا کے لیے یہ نہ کہو۔ وہ پکڑا جائے گا اور پھر۔"

"قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوگا۔"

"کل ہمیں انتوفاگاسٹا پر قیام کرنا ہی تھا۔ اسے بھی ساحل پر اتار دیتے۔"

"جی نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ کپتان کا ارادہ ہے کہ وہاں سے گزر جائیں۔"

"تو پھر یہ فیصلہ کن بات ہے؟"

اندرومی لی او کھڑا ہو گیا اور چپکے سے ابھی ابھی جس سگار کو جلایا تھا اسے بجھا دیا۔

میں اس قدر مضطرب تھا کہ احتجاج کی ہمت نہ ہوئی۔ میرا دل سینے میں پس گیا تھا۔ میں سر کو ہاتھوں پر رکھے بیٹھا ہوا تھا اور مرد بروقت سے بے نیاز تھا۔

اندرومی لی او انتہائی غور کے ساتھ مجھے تفتیشی نظر سے تک رہا تھا۔ اس نے پیار سے کندھے کو تھپکتے ہوئے اک ایسی آواز میں کہا جو شدتِ جذبات سے پہچانی نہ جاتی تھی۔

"ری کارڈو! ہم نے امکان بھر کوشش کر ڈالی ہے۔"

اور باہر چلا آیا۔

"بیحد تاخیر ہو گئی ہے بیحد"۔ میں ان الفاظ کو بار بار یوں دہرا رہا تھا گویا کسی کتاب کا

سبق ہیں جو مجھے یاد کرنا ہے۔ بعید نا خیر! غالباً اس سے پہلے بھی کسی جہازی نے اس کو تاڑ لیا تھا اور وہ اس بات کے متعلق خاموش رہنے کی قیمت بھی چاہتا ہوگا ورنہ — میں خیال سے ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس نے محنت کش سے مقابلہ کر کے رَن سر کیا تھا جانے اس معرکے کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا ممکن ہے وہ محنت کش اسے بچا لیتا۔ لیکن نہیں۔ وہ وحشی بہت پست واقع ہُوا تھا اور معاملہ زیادہ دیر تک درونِ پردہ نہ رہتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ موت معرضِ التوا میں پڑی رہتی — اور بس!

گزشتہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اس رات کوٹھڑی میں وہ کس قدر دیوانہ وار مجھ سے وابستگی کی آرزو کرتا تھا۔ اس نے کس طرح میرے پاؤں پکڑ رکھے تھے اور رحم کی بھیک مانگتا تھا۔ بیچارہ چینا! بے شمار معصوم ان خوابوں کا شکار بنا کر تباہ کر دیئے جاتے ہیں جو انہیں ان لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں جنھیں انہی خوابوں سے جلبِ منفعت کے سوا اور کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کروڑوں بے ضرر روحیں مصیبت جھیلتی ہیں، مشقت کرتی ہیں اور درندہ صفت جذبات کی غلامی میں دم دے ڈالتی ہیں۔ وہ انسانوں کی حماقت اور جہالت جس کا آغاز تو محض اک خفیف جذبۂ جابریت کے ماتحت ہوتا ہے مگر جس کا اختتام ذلت کی بدترین گہرائیوں اور مہلک ترین انحطاط کا مرکز ٹھہرتا ہے۔ میک لین نے سچ کہا تھا۔ ہم سب درندے ہیں۔ میں خود درندہ ہوں۔ مگر اب میں کیوں اک ریاکارانہ محبت جتانے والی کسبی کی طرح واویلا کر رہا ہوں، بذیان بک رہا ہوں؟ میں مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوں گا۔ میں کپتان کی حکم عدولی کروں گا۔ میں اس کا ایک ایک گناہ اس کے منہ پر دے ماروں گا۔ لیکن کیا ابن الوقتی اچھی نہ رہے گی کہ جھوٹی تابعداری کا اظہار کروں۔ چینے کے کرائے کی ادائیگی کے لیے پیشکش کروں۔ اس میں ساری تنخواہ لگا دوں اور ضرورت پڑے تو اپنا سب کچھ بیچ ڈالوں اور اپنی آخری کوڑی تک نذر کر دوں۔ مگر یہ سب کچھ لغو ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے کپتان مجھے تقصیر وار ہی نہیں ٹھہرائے گا بلکہ تقصیر منوائے

گا بھی! چینے کا نام فہرست میں کہیں درج نہیں غریب کی دستاویزات بھی کوئی نہیں وہ دفتری طور پر مرا ہُوا ہے۔ چینا مر گیا ہے یہ خیال مجھ پر مسلط ہو گیا۔

"وہ مر گیا ہے۔ وہ مر گیا ہے۔" میں ان الفاظ کو دہرائے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح دہرائے جا رہا تھا۔ میں نشست پر لباس میں پوری طرح ملبوس، نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ "وہ مر گیا ہے! وہ مر گیا ہے!" اور وہ مند گئیں!

"وہ مر گیا ہے۔" دور افتادہ خواب کی سلطنت سے اِک آواز آ آ کر مجھ میں گونج رہی تھی!

مجھے وقت کا کچھ تصوّر نہ تھا۔ ہو سکتا ہے تین بجے ہوں۔ ہو سکتا ہے چار بجے ہوں۔ میرے کمرے میں لیمپ تک جل رہا تھا۔ میں اُس خاموشی میں گھٹ رہا تھا جو آدھی رات کے وقت جہاز پر طاری ہوتی ہے جب وہ عین سمندر میں ہو اور اس کے جوانب و اطراف سے لہروں کے ٹکرانے اور نلکوں میں پانی کے دوڑنے کی بھدی آواز کے سوا اور کوئی آواز کانوں میں نہ پہنچتی ہو۔ مجھے خیال سا ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے اور دروازہ ہلکے سے بند ہُوا ہے۔ میں جاگ پڑا۔ معاً اک جھٹکا ہُوا اور دانتوں کا برش گلاس میں بجنے لگا۔ میری آنکھیں پوری طرح کھُل نہ سکیں نیند نے انھیں بُری طرح مقفل کر رکھا تھا "ری کارڈو"۔ — کوئی آواز تھی کیا؟ میں بیٹھ گیا۔ چینا کمرے کے درمیان کھڑا تھا اور جہاز کے ہلتے سے لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ اگرچہ پیلا پڑا ہُوا تھا مگر مسرور تھا۔ "چینا" میں ہچکیاں لے رہا تھا۔ میں نے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔ میں بھی مسرور تھا۔ زندگی پھر سے درخشاں اور پُرلطف ہو گئی تھی۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ اُسی نے کہا تھا "ری کارڈو" معمولاً وہ مجھے عزت سے بلاتا تھا مگر اب کے اس نے دل کے اندر سے، جذبات کی اتھاہ گہرائیوں سے مجھے پکارا تھا۔

وہ بیٹھ گیا اور میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔ "آج میں نے سہ پہر

بچاؤ کشتی میں بسر کی ہے۔ وہیں میں نے جہاز رانوں کو کہتے ہوئے سنا کہ انتوفاگاسٹا پر پڑاؤ نہیں ہوگا۔ بس یہیں میرا خاتمہ ہے۔"

"پگلا، چینیا۔" میں عالم یاس میں متامل تھا۔ مجھ میں نا امیدی کی تاریک لہر اٹھی اور تمام کائنات کو تاریک کر گئی۔

"اب خاتمہ ہے، ریکارڈو۔ مجھے معلوم ہے، میں چینی ہوں، موت زندگی کی بدترین شئے نہیں ہوتی۔ تم جانو ہم سب خوابوں کے بندے ہیں۔ خواب کے بغیر مر جانا سب سے ہولناک چیز ہے۔ لیکن میں تو خواب دیکھا کرتا ہوں، ریکارڈو۔"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرا نام بار بار زبان پر لانا چاہتا ہے۔ "مجھے ایک بات کا افسوس ہے۔" اس کے چہرے پر غم کے آثار ہویدا تھے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم — اور معاف کرنا جلدی یہ بات غیر اہم ہو کر رہ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دل میں یہ خیال لاؤ کہ میں نے جھوٹ بھی بولا ہے۔ میں نے اس آدمی کو انکار کر دیا تھا تم جانو تمہارے آنے سے پیشتر اس نے پیش کش کی تھی۔"

"بس ننھے بس! کسے تمہارے کیے کا دھیان ہوگا؟ تمہارے عذر سے بیس گنا زیادہ تو وہ جانکنی کی کوفت ہے جو تم برداشت کر چکے ہو۔" میرا جی چاہتا تھا کہ اضافہ کر دوں — "میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تم جیتے رہو!" لیکن میں ان الفاظ کے اضافے کا حوصلہ نہ کر سکا! یوں کرنا تم ظریفی کی سفاکی کے مترادف تھا۔

"ریکارڈو! میں اپنے آپ کو حوالے کر دینے کو ہوں۔ میری آرزو تھی۔" اس کی آواز غوطہ کھا گئی مگر اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور آنسو پی کر کہنے لگا۔ "میری آرزو تھی کہ تمہیں ایک بار پھر دیکھ لوں! تم سے کچھ باتیں کر لوں۔ عزیز دوست! تمہارا شکریہ اور اندرو دمی لی او صاحب کا بھی شکریہ۔ جو کچھ تم نے میری خاطر کیا، میں اس کے قابل نہیں تھا۔ میں اک غریب چینی لڑکا ہوں۔ کسی کو بھی اعتبار نہ آیا کہ میں ارجنٹائن کا باشندہ ہوں۔

مجھے خود بھی اعتبار نہ رہا۔ میں چینی ہوں، چینی۔ میں ہوں بھی چینی ریکارڈو! میری ماں بھی چینی کی تھی، ہم مسکراتے ہوئے مرتے ہیں! اور ہم احسان بھولتے نہیں!"

وہ مشرقیوں کے دستور کے مطابق فرش پر بیٹھ گیا اور جس طرح پہلی ملاقات پر میرے ہاتھ کو چوما تھا، اسی طرح پھر اسے بوسہ دیا۔

میں نے اوپر نگاہ کی۔

اس دفعہ وہ نہ دیا نہ چلایا۔

اس کے چلے جانے کا مجھے تبھی احساس ہوا جب جہاز کے ہلنے سے دروازہ زور کے ساتھ بند ہوا۔ روشندان صبح کے نور میں نہا رہا تھا۔ میں نے لیمپ بجھا دیا۔ سمندر سیاہی کی مانند سیاہ تھا، آسمان نیلگوں تھا مگر مشرق کی طرف اپنے چہنے کی طرح صاف صاف زرد تھا۔

دوسرے روز میں صبح صبح اُٹھ کھڑا ہوا اور دفتر میں غرق ہو گیا۔ میں تندہی سے کام میں مصروف رہا۔ اتوار کا روز تھا، ساڑھے گیارہ میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور دوسرے کپڑے اتار کر وردی پہن لی۔

جلد ہی خدمت گار نے طعامِ شب کی گھنٹی بجائی۔ کپڑے پہننے کے بعد میں سوچ رہا تھا۔ "عجیب بات۔ ہے نا۔ یہی کھانے کا بلاوا۔ نماز عشائے ربانی کا بلاوا کیوں نہیں۔ کیوں نا یہ طعامِ شب 'قربانی' ٹھہرے اور میز قربان گاہ اور میں اتوار کے بہترین لباس میں ملبوس رسوم کا ادا کرنے والا پادری۔ اردگرد یہ ملعون کیسنے اکٹھے ہو جائیں اور اپنے ان گناہوں کی پُرفریب معافی کی التجا کریں جنہیں یہ سچے دل سے محسوس تک نہ کرتے ہوں۔ چاہیے تو یہی کہ نماز عشائے ربانی ادا کریں!" اس سے پہلے کبھی بھی نماز عشائے ربانی کی روح نے مجھ میں اس قدر مکمل طور پر حلول نہیں کیا تھا۔

اس خیال سے مجھے روحانی فیضان مل گیا تھا۔ میں پُرسکون تھا۔ مطمئن تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور ہال کمرے کی راہ لی۔ صرف اندرومی لی او غیر حاضر تھا کہ وہ دیدبان میں کام کر رہا

تھا۔ میں نے رسماً سر کو جھکایا اور جواب بڑی شائستگی سے دیا گیا۔ کپتان نے خوش خلقی سے سر کو ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ اس کا یہ فعل حیرت زا تھا۔ وہ موضوع سے بے نیاز ہو کر ہر طرح کی گفتگو میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس لمحے سیاست کو فوقیت نصیب تھی۔ ہسپانوی انقلاب، اشتراکیت اور فاشیت پر بحث جاری تھی اور اس میں دن کی مسافت کی شرطیں اور پہنچنے کے وقت کی پیش گوئیاں مداخلت کا باعث ہوتی تھیں۔ پرسر اور چیف انجینئر بڑی سرگرمی سے مصروفِ دلائل تھے۔ لیکن جس چیز نے میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اس کا کوئی ذکر اذکار نہ آیا۔ اک دور کا اشارا تک نہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا تین ناقابلِ برداشت دنوں کی ہولناک شہادت محض اک بُرا سا خواب تھا جسے میری پریشاں خیالی نے جنم دیا تھا۔ سب کچھ فضول تھا۔ بے حقیقت! ہم روزانہ کے معمول کو انجام دے رہے تھے۔

کپتان نے غیر متوقع طور پر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! مریض کا کیا حال ہے؟"

میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "سنبھل جاؤ کہ موضوعِ سخن بدل رہا ہے اور اسی سے مجھے دلچسپی ہے۔"

"پہلے سے بہتر ہے جناب، ہے تو سوکھا ہوا مگر اس سے نپٹنا خاصا مشکل کام ہے۔ کہتا تھا کہ مجھے بدلہ لینا ہے اور دال پیے رسے زور کے پڑاؤ سے پہلے ہسپتال سے نکل کر رہوں گا! اس حساب کو چکا کر چین لوں گا۔"

"اسے سنبھالے رکھو ڈاکٹر کہ آپس کی چپقلشیں تکلیف دہ ہوتی ہیں!"

"جی! اب تو ٹھیک ہے سب کچھ! جس نے اس کے چاقو مارا تھا وہی اس کا دوست بن گیا ہے۔ اس سے ملنے آتا ہے۔ اس کے پاس بیٹھتا ہے اور دونوں تاش کھیلتے ہیں معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں کوئی اور ہی چیز ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے کنکھیوں سے دیکھا۔ اس کا یوں دیکھنا کچھ بھی واضح نہیں کر رہا تھا۔

یہ نماز عشائے ربانی کا پیندہ تو نہیں تھا؟

اس دوران میں پرسر اور چیف انجینئر جہاز کی رفتار پر مصروفِ بحث تھے۔

"مگر چیف، کتنے میل کہا تھا آپ نے۔ تو گویا روزانہ مسافت اتنی ہے؟ اگر یہ فرض کر لیں کہ کسی طوفان اور باد سرسر سے دوچار نہ ہوں گے تو بھی دوپہر سے پہلے ڈال پے کے نزدیک پہنچنا ناممکن ہے۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ چار بجے پہنچیں گے۔"

"نہیں میک لین صاحب! چار بجے تو آپ روو باد انگلستان میں جانی واکر کی سانویں بوتل کو سپرد آب کر رہے ہوں گے!"

"تو یوں کرنے کے لیے آپ کو کوئلے کے علاوہ کچھ اور بھی جلانا ہوگا۔"

"جی، جی۔ جی جناب!"

"آہا! جی! تو اپنی جہنمی ہیودہ گوئی کو ختم کر دیجیے اب!" بوڑھے ملعون نے جواب دیا۔ اس کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ نمایاں تھی۔

یہ سفر آسمانی کی سربلندی تھی!

میں نے تصور میں جینے کے مبتلائے جانکنی و کرب بچہ کے آگے اپنے تائب و شرمسار سر کو جھکا دیا۔ پر سر میرے دل کی حیاتِ ربانی کو مشکوک نظر سے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ممکن ہے مجھے وہ مضطرب گھبرایا ہوا اور شاید خوفزدہ سمجھتا ہو۔ میں نے خشوع و خضوع سے دعا مانگی۔ بالآخر مجھے اک مسعود اور انتباہ روحانی سکون نصیب ہو گیا۔

ہم میز سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جہاز کے بیچ کے حصے میں تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد میں دفتر میں چلا آیا اور دال پے رے زد کے پڑاؤ کے متعلقہ کاغذات کی تیاری میں لگ گیا۔

جب میں دفتر سے فراغت پا کر عرشے پر آیا تو سارے چھ ہو رہے تھے۔ غروبِ آفتاب کا منظر دلکش تھا۔ خوش قسمتی سے ہمارے مخالف، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ریلے تھم گئے تھے۔ سمندر کی سطح آئینے کی طرح ہموار تھی۔ رات کے آنے سے سمندر کی لہریں پاس سے

بسرعت گزر رہی تھیں۔ جس سے جہاز کی تیز رفتاری کا اندازہ بآسانی ہو سکتا تھا۔ میں نے عرشے کے اوپر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی اور افشاں و خیزاں پانیوں اور ہر آن رنگ بدلنے والے سمندر کے متلون گردابوں کے پُرنشاط سحر میں کھویا ہوا تھا۔

میں نے اپنا بازو دیوار پر رکھا ہوا تھا۔ اک اور بازو کی رگڑ ہوئی — وہ تھا اندرومی لی اد کا بازو۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولا اور ہم دونوں سمندر کو تکتے رہے۔ شام کو آخری جانے والے سٹیمر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ جس کنارے ہمیں لگنا تھا، اس پر روشنی کے میناروں کے نور مشعلوں کے شعلوں کی طرح برس رہے تھے۔ عین ہمارے سروں کے اوپر بادلوں کے چند ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ معاً ڈوبتے سورج نے انھیں منور کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آمد شب سے پہلے ساحل اس منعکس لو میں گم ہو کر اک غیر ارضی زندگی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ گدازیت سے بھرپور گلابی رنگ نے اوپر کے حصوں کی سفیدی کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یاقوت کی طرح تاباں لہریں آسمان کی درخشانی کو شرمندہ کر رہی تھیں۔ میں نے اندرومی لی اد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس رات ہم آسمان کو تکے جا رہے تھے۔

اس کے لب ہلے۔ اس کی آواز کچھ کہنے کی کوشش میں گلوگیر تھی "وہ چنبیلیاں دیکھو!"

میں نے مشین کی طرح کہا مانا۔ اس مافوق فطرت روشنی کے سکون میں دھوئیں کی اک لکیر چمنیوں سے اٹھ رہی تھی! اوپر ہی اوپر جا رہی تھی۔ نیلاہٹ بھرا دھواں — آسمانی نیلاہٹ — ملکوتی نیلاہٹ!

میں غش کھا کر تختۂ جہاز پر اوندھے منہ گر پڑا۔

(۱۰)

مجھے سخت بخار ہو گیا جو اپنے ساتھ بحران اور ہیجان کا اک سمندر لے آیا۔ وال پیرزو پہنچنے سے پہلے کے چار روز کی یاد میرے ذہن سے قطعاً مفقود ہے۔

ایک روز صبح کے وقت مجھے محسوس ہوا کہ ہم بندرگاہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ روشندان

پوری طرح کھلا ہُوا تھا اور اس سے سمندر کی تازہ ہوا آ رہی تھی - اگرچہ مراجعت پر روشندان کھلا ہُوا تھا - مگر کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی تھی - جہاز کے داخل ہونے کے وقت مجھے اچھلتی ہوئی لہروں کے سفید رنگ جھاگ روشندان سے نظر آ رہے تھے - جہاز کو لنگر انداز کرنے کی خاطر لوہے کے رسّوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور عرشے پر پیروں کے پے بہ پے چلنے اور رینگنے سے اک اودھم سا مچ جاتا ہے - اوپر وہی عالم طاری تھا -

اندرومی لی اد بیٹھا ہُوا تھا اور اس کی نگاہیں مجھ پر جمی تھیں -

" پہلے سے اچھے ہو ناری کارڈو ! "

" میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں بھائی ! "

اور یہ تھا بھی سچ ، چپ چاپ پڑے رہنے سے میرے اعصاب کو سکون میسّر ہو گیا تھا - کسی کوشش ، تگ و دو اور ہمّت کے صرف کے بغیر میری صحت عود کر آئی تھی - میں ٹھیک ٹھاک تھا - مطمئن تھا - تھوڑی بہت لنگڑاہٹ ضرور تھی مگر قدرت نے ماضی کو بھول جانے اور اقدار کو صاف سمجھنے کی قوت سے نواز دیا تھا - اندرومی لی اد کی آواز نے پچھلے توہمات کی یاد کو تازہ کر دیا - بیتے ہوئے مصائب کا پورا باب نظروں کے سامنے کھلا پڑا تھا - لیکن مجھے خیال سا آیا کہ ان واقعات میں مبالغہ آرائی کو بھی خاصا دخل تھا - میں متعجب ہو کر مسکرا پڑا اندرومی لی اد نے کہا - " وال پے رے زد اُ گیا ہے " اور ہچکچاتے ہوئے اضافہ کیا " مگر کمزوری سے تم اُٹھ نہ سکو گے "

میں نے اٹھتے ہوئے احتجاجاً کہا " اجی رہنے بھی دو ! ایک منٹ میں کپڑے پہن کر تھیلے میں چیزیں بھر ڈالوں گا — اور خدا حافظ ! "

" تو کیا جا رہے ہو ری کارڈو ! ؟ "

" ہاں ہاں ! اور کروں بھی کیا یہاں ؟ اس سفر نے ثابت کر دیا ہے کہ میں سمندر کے کام کی چیز نہیں ہوں - جہاز کا روزمرّہ اک بحری داستان کو تو زیب دے سکتا

ہے مگر حقیقی زندگی کے لیے سخت کٹھن معاملہ ہے۔"

"ریکارڈو! تمھارے جانے سے میں کھو جاؤں گا! تمھاری صحبت نے زندگی کو قابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ اب اس جہاز پر ہمارے نصیبوں میں دوست کہاں؟"

جب وہ چلا گیا تو میں نے کپڑے پہننے شروع کر دیے۔ اس کے الفاظ سے مجھے قلق تو ہوا مگر جواباً میں کہہ بھی کیا سکتا تھا جو چند چیزیں میرے پاس تھیں وہ تھیلے میں بند کر دیں۔ میں نے دراز وں کو بھی دیکھ ڈالا کہ ان میں کوئی شئے دھری نہ رہ جائے۔ جاتے ہوئے میری نظر اک صندوق پر پڑی جو نشست کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ جائزے کے لیے اسے کھولا تو اک پھٹا پرانا کرتا نکلا جو بوسیدگی سے دھجیاں بن گیا تھا اور قطعاً ناقابلِ استعمال تھا۔ پہلے پہل تو سمجھ نہ آتی تھی کہ یہ کس کا کرتا ہے۔ پھر مجھے سوئیٹر کا قصہ یاد آ گیا۔ یہ چینے کی ملکیت تھا۔

میں پیشانی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ پھر اک بھیانک خواب جسے بھولنے کے لیے مضطرب تھا۔ اب اسے کیا کروں؟ روشندان سے باہر پھینک دوں۔ نا۔ سامنے ہی بندرگاہ ہے اسے کمرے میں بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ یوں کرتا خواہ مخواہ کی چہ میگوئیوں کو مدعو کرنا ہے۔ اسے تھیلے میں ہی کیوں نہ ٹھونس لوں؟ نہ! اسے رکھوں ہی کیوں؟

اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس رات چینے کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ وہ نہ ادھر کا تھا نہ ادھر کا! اتنی وسیع کائنات میں اسے ذرا سی جگہ نصیب نہ تھی۔ میرا کمرہ بھی اُسے ٹھہرا نہ سکا! اور میرا دل؟ یہ تو تھا ہی گاؤدی!

میں نے تھیلا بند کیا اور باہر چلا آیا۔ مری رگ و پے میں خون کھول رہا تھا۔ کرب و بلا اور توہم نے شدت کے طیش و غضب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے آپ پر طیش آ رہا تھا۔ اور اس چیز پر طیش آ رہا تھا جسے زندگی کہتے ہیں۔

افسروں سے علیک سلیک لیے بغیر میں جہاز کی باہر جانے والی راہ پر پہنچ گیا۔ میں کسی

قسم کی توجیہ اور بیان دینے کا آرزومند نہ تھا۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ راہ کے اس سرے پر کپتان موجود تھا اور اندرومی لی اوکو حکم صادر کر رہا تھا۔ اس کا مستقل مچھر، موٹا، پھیپھسا جسم، سرخ چہرہ، متمردانہ ظاہریت دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مرے دل میں اس سے پہلے اتنی شدت کی نفرت کے شعلے کبھی بلند نہ ہوئے تھے! میں نے کندھے پر تھیلا رکھا اور اس راہ سے نیچے کو جانے لگا۔ مجھے توقع تھی کہ نظریں بچاتے نکل جاؤں گا۔ مگر دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ وہ حرامی پیچھے سے غرایا۔

"اب سے ہم جہاز میں ایسے رنگیلوں کو لینے سے رہے!!"

میں سرخ بھبوکا ہو گیا۔ میں نے تھیلے کو زمین پر دے مارا اور مارے غصے کے لال پیلا ہو کر اک آتشیں دیو کی طرح اس پر پل پڑا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس حرامی درندے کے لیے ہنگام حجم سے بدلہ لے لوں جو میری نحیف طاقت کے سامنے اک دیو پیکر کی مانند خوفناک نظر آتا تھا۔

دو آہنی بانہوں نے مجھے پیچھے سے روک لیا — اندرومی لی او کے بانہوں نے جکڑ رکھا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے! اسے فنا کر ڈالوں گا میں!" میں غرا رہا تھا۔

"ریکارڈو — میرے تو کپتان ہیں وہ! — جاؤ بھی اب — جاؤ۔"

"جہنم رسید کرو فرض! — چھوڑ دو مجھے ورنہ —"

میں نے اس کے منہ پر مکا جڑ دیا۔ اندرومی لی او نے میرے جبڑے پر ضرب جو لگائی تو میں تھیلے کے اوپر دھرا تھرا، ڈھیر سا ہو کر لڑھکتا آیا اور زمین پر پہنچ گیا!

کپتان نے اندرومی لی او سے کہا جو اپنی وردی کو درست کر رہا تھا۔ "اچھا بھئی افسر صاحب! بہت شکریہ لیکن وہ یہاں کے قابل نہیں تھا!"

اندرومی لی او نے جواب دیا۔ "کپتان صاحب! آپ غلطی کر رہے ہیں۔" پھر اپنے

کوٹ اور ہیٹ کو اتار کر کپتان کے پیروں پر پٹخ دیا۔ "کپتان صاحب! افسر سوئم کی جگہ کے لیے مجھ سے بڑا بدمعاش ڈھونڈیے! میرے لیے اس جہاز کی نوکری کوئی اچھی شئے نہیں تھی!" میرے پیچھے پیچھے قمیص پہنے وہ بھی رواں دواں آ پہنچا! اس کی سیاہ گھنگریالی لٹیں ہوا میں لہرا رہی تھیں!

ایرناندو تیلیشٹ

خاک باد

آنے والے کے طور اطوار سے خاصا شہد اپن مترشح تھا۔ وہ جس بات کو کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکتا تھا اسے کہہ ڈالنے کے لیے آدھ گھنٹے سے سعئی لاحاصل میں مصروف تھا۔ گھر کے دروازے کے پاس کی بھاری بھرکم شہتیری پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس نے میل آلود بھورے مندے کی سستی ٹوپی کو سر سے نہ اتارا تھا۔ باتیں کرنے کے دوران میں اس نے آنکھیں جھکائے رکھیں۔ جوآن اسے خوب جانتا تھا۔ وہ سائمن آرسے والا اور اس کی بیوی لاؤرا کا بیٹا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بدنام تھا۔ مگر اب وہ کہتے تھے کہ ان میں سے کسی نے اس بات کا خواب تک بھی نہ دیکھا تھا کہ وہ واقعی وہ کچھ کر گزرے گا جو وہ اپنے والدین کے ہمسایہ دوستوں سے کر رہا تھا۔ جوآن ان باتوں پر اعتبار نہ کرتا تھا لیکن اب ....." آپ کے لیے بہتر یہی رہے گا کہ یہاں سے چلتے بنیں۔" وہ نظروں کو اوپر اٹھائے بغیر بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔ جوآن نے جواب میں چُپ سادھ رکھی تھی۔ دن دھیرے دھیرے نکل رہا تھا اور سیاہ رنگ کے بادلوں سے زور کی بارش کے آثار ظاہر تھے۔ فضا میں گھمس چھائی ہوئی تھی۔ جوآن نو آمد کی ٹوپی کے اوپر سے دور کا منظر دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں کا منظر۔ سبز، زرد، سنہرے پھر سبز شوخ سبز اور پھر زرد تر۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے وادی کا منظر خاصا نظر آتا تھا۔ اناج کے سبز خوشوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے دیکھنے کے لیے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔

"کون ہے؟" باورچی خانے سے اس کی بیوی کی بلند اور صاف آواز آئی۔ وہ خاموش

رہا۔ نوآمد سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ اپنے ایک گرد آلود بوٹ سے باریک مٹی کے ننھے سے ڈھیر کو کھرچ رہا تھا اور دوسرے بوٹ کے تلے سے اسی مٹی کو دباتا جا رہا تھا۔ "بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے چلتے بنیں۔" اس نے پھر کہا اور اب کے اس کا چہرہ نمایاں تھا۔ جوآن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور دل میں کہا۔ "آنکھوں کے سوا ہو بہو باپ کا چہرہ لیے ہوئے ہے اور آنکھیں ماں کی ہیں جن کا رنگ تمباکو کے پتے کا سا تھا۔"

"کون ہے؟" اس دفعہ اس کی بیوی کی آواز قریب تر آتی ہوئی سنائی دی۔ اب کارمن بچے کو گود میں لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ جو سامنے کے چھتے میں کھلتا تھا۔ نوآمد شہتیری سے اُٹھا اور اضطراری طور پر اپنے ہاتھ سے پتلون کے مقامِ نشست کو ملنے لگ پڑا پھر اس نے تعظیماً ٹوپی اتاری۔ موٹے سیاہ جٹے ہوئے بال یوں اٹھ کھڑے ہوئے گویا قید سے آزاد ہو گئے ہوں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھیں مدت دراز سے کنگھی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا "کارمن صاحبہ صبح بخیر۔" اس نے کہا۔ بچہ ماں کی گردن سے کھیل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ انگلیوں کو اس کی گداز بیت میں داب دے۔ چند ماہ کا بچہ چارخانہ کھیس کے میلے ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا اور دونوں سے ماں کے دودھ کی بساند آ رہی تھی۔

جوآن نے کچھ نہ کہا۔ نوآمد صریحاً گھبرایا ہوا اور خفیف نظر آتا تھا۔ اس اثنا میں کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔ اک دیہاتی علاقوں کا سکوت طاری تھا۔ وہ سکوت جس میں فطرت کا شور و غل سدا جذب و خوابیدہ ہوتا ہے۔ ساری وادی اداس صبح میں پورے طور پر دھڑک رہی تھی۔ جوآن نے دل میں کہا "سورج نکلنے ہی والا ہے۔"

نوآمد نے کہا۔ "اچھا تو میں چلتا ہوں۔" مردوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ کارمن خاموش تھی۔ اس کی نظریں خاوند پر مرکوز تھیں۔ نووارد نے اپنی ٹوپی پھر سے پہن لی۔ ان کی طرف پیٹھ کی اور ہولے ہولے جنگلے کے دروازے کی طرف چل پڑا جو گھر سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اور اسے بہت احتیاط سے کھولا مگر اس کی احتیاط کے باوجود تیل سے

محروم قلابوں نے عادتاً چین بیں کر ہی دی۔ قلابے مقامی لوہار کے بنے ہوئے عام قسم کی چیز تھے "بہتر یہی ہے کہ وہ چلتے بنیں۔" کیوں؟ سائمن آرے والو اور اس کی مرحوم بیوی لاؤرا کا بیٹا قریباً آدھ گھنٹہ بھر دلائل کی وضاحت بیان کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی گفتگو بک بک جھک جھک کے مترادف رہی۔ حکام اور سیاست کے معاملے ہمیشہ اک الجھن ہی ہُوا کرتے ہیں۔ سائمن آرے والو کا بیٹا حکام کے ساتھ کھی کھیڑی تھا اور ان کے حقیر سے حقیر کام انجام دیتا تھا۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ موجودہ الجھیڑے کے متعلق اس کا اپنا ذہن پراگندہ تھا اور معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھا جو آن نے سوچ کر کہا "بدمعاش کہتا تھا کہ اگر ہم اس ہفتے کے آخر تک نہ نکلے تو وہ اور بدمعاشوں کی امداد سے ہمیں نکلوا کر رہے گا۔" کارمن نے کہا "جان سے مار ڈالیں پہلے۔ زندہ نکلنے سے رہے ہم۔"

"یہی کہا تھا میں نے اس سے۔" جو آن نے کہا۔ اس کا چہرہ تیرہ و تار افسردگی کا مظہر تھا۔ ان میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ کارمن بچے کو سنبھالے باورچی خانے کو چلی گئی اور جو آن اپنے گھر کے سامنے اک شجر کی طرح تنہا کھڑا رہ گیا۔

قرب و جوار پر اک عسرت برستی تھی اور اس بات کی کوئی معقول وجہ نظر نہ آتی تھی کہ آخر یہ افسرانِ بالا جو آن کے گھر اور آس پاس کے کھیتوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ انھیں اس اقدام سے حاصل بھی کیا تھا ہوے دے کے تھا بھی کیا؟ اناج کے چند قطعے۔ آلوؤں کے کچھ ٹیلے اور ایک سبزیوں کی کیاری اور ان میں بہنے والی پانی کی نہر جو بفضلِ ایزدی، کارمن کے کہے مطابق، ہر تادوز کی واقعی عظیم اور نفیس ملکیت سے نکل کر ادھر بہہ نکلتی تھی۔ رہا گھر تو یہ آدھا جھونپڑا تھا اور آدھا گھر۔ جو آن سوچ رہا تھا کہ اگر حکام نے یہ گھر اس سے چھین لیا۔ تو انھیں اس رقم کا بقایا بھی چکانا ہوگا جو اس نے باورچی خانے اور گندگی کا حوض بنانے کی خاطر برسوں ادھر قرض لی تھی۔ لیکن کیا یہ واقعی سچ تھا کہ سائمن آرے والو کے بیٹے کے بقول انھیں یہاں سے اٹھتے ہی بنے گی یہ واقعہ ہے کہ اس نے پچھلے انتخاب کے دوران ووٹ ڈالا تھا۔ تو پھر کیا؟ کون تھا جس نے نہیں ڈالا

تھا ووٹ ۔ کسی نے اس کی حمایت کی اور کسی نے اُس کی اور سب کوئی اپنے اپنے گھر خوش۔ اک نہ اک کی شکست لازمی تھی اور اک نہ اک کی جیت! جوآن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ یونہی مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا وہ ۔ مگر نہیں ۔ یہ بات نہیں تھی ۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے ہفتے جب وہ قصبے میں گیا تھا۔ تو اک عجیب بات اس کے دیکھنے میں آئی تھی ۔ کچھ سپاہیوں نے بندوقوں کے علاوہ قمچیاں بھی اٹھا رکھی تھیں ۔ بندوق تو خیر مگر یہ قمچیاں کیوں ؟ اس بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا ۔ وہ قانون کے ہاتھ میں قمچی دیکھ کر سہم گیا تھا ۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کے برتاؤ میں اک بیگانگی سی محسوس کرتا تھا ۔ 'دان رومولو نارز' کی دکان میں اس کے ہاتھوں تیل فروخت کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ کہا اس سے یہی گیا تھا کہ تیل ہے نہیں ۔ مگر تیل موجود تھا ۔ کثیف اور چمکیلا ، سیاہ ڈرم سے کیف میں اور کیف سے کاؤنٹر کے پیچھے رکھی ہوئی بوتل میں ٹپک رہا تھا ۔ جس طرح دان رومولو نے اسے دیکھ کر آنکھ بھوں چڑھائی تھی ۔ اس کے پیش نظر اس نے چپ میں بہتری سمجھی اور یوں بھی اس نے کسی سے بات چیت کرنے سے احتراز ہی کیا ۔ اگرچہ چوک میں بھیڑ ویڑ کچھ نہیں تھی ۔ پھر بھی چار سپاہی اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے ۔ اس نے چند چیزیں خریدیں — ایک ہنڈیا ۔ کپڑے دھونے کا ڈنڈا صابن اور چپلوں کا جوڑا ۔ اس کے بعد وہ دواؤں کی دکان میں گیا کہ خوشبودار ویسلین کی شیشی اور روئی کا بنڈل خریدے ۔ بینا وائدز نامی مالک دوکان نے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہوئے ، راز دارانہ انداز میں اس سے پوچھا "کھو بھٹی راہ میں کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا ۔" جوآن جواب دینے کے لیے لب کھولنے کو تھا کہ بینا وائدز نے چپ رہنے کا اشارہ کر دیا ۔ ایک سپاہی اندر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے کون تھا ؟ سائمن آرے والو کا بیٹا ۔ سپاہی نے تڑاخ سے چوبی کاؤنٹر پہ چابک جڑ دی ۔ بینا وائدز کا رنگ اڑ گیا اور اس نے جلدی جلدی جوآن کی خریدی ہوئی چیزوں کو کاغذ میں باندھ دیا ۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں ؟" سپاہی نے پوچھا ۔ آرے والو نے جوآن کو پہچان تو لیا مگر اسے دیکھا یوں گویا کبھی پہلے ملا ہی نہیں ۔ سپاہی نے بینا وائدز کو جواب دینے کی مہلت نہ دی قمچی کو اپنی

پتلون پر مارتے ہوئے جوآن کی طرف مڑ کر کہنے لگا "تو تم بھی ان لوگوں میں ہو جو مزاحمت کر رہے ہیں؟" اس کا رنگ بھی بینا وائڈز کی طرح پیلا پڑ گیا ہوگا کہ اسے محسوس ہوا، اس کا دل دھک دھک کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سپاہی کے منہ پر اک چپت جڑ دے۔ آخر وہ سپاہی تھا اور اسے کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ اس انداز سے اُس امن پسند شخص سے گفتگو کرے جو کسی کو دق بھی نہ کر رہا ہو اور دواؤں کی دکان میں محض خوشبودار ویسلین کی شیشی اور روئی کا بنڈل خرید رہا ہو۔ آرے والو بول اٹھا۔ "جی ہاں! ان کا شمار بھی سرخوں میں ہے اور آپ 'ترس' اس پی گاز' والی راہ سے ادھر، یہیں نزدیک ہی رہتے ہیں۔" جوآن یوں کھڑا تھا جیسے فرش میں گڑ گیا ہو۔ اس کی نظریں چھوٹے سے چوبی ڈنڈے پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کے ایک سرے کے چھید میں چمڑے کے تسمے بندھ رہے تھے۔ گانٹھ دار ڈنڈا اک لمبی انگلی تھی جس کا ہر جوڑ، جوڑوں کے درد کی وجہ سے سوج رہا تھا۔ وہ کرخت، خاکی رنگ کپڑے کی وردی پر قمچی ہلکے ہلکے مارتا چلا جاتا تھا۔ سپاہی پُرمعنی انداز میں غرایا "ہوں م۔ ہوں م۔" آرے والو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "مگر اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ ہے یہ خوش طبع۔" قمچی تھم گئی۔ بناؤٹی مسکراہٹ سے سپاہی کا چہرہ شکن آلود تھا۔ "تو خیر دیکھا جائے گا۔ مگر ہیں یہ سب اک سؤر کے بچے اور سنو جی بینا وائڈز! یہاں کسی قسم کا لچ پن نہ ہونے پائے اور ارے او تم سے بھی کہہ رہا ہوں، سنا؟" وہ چلے گئے۔

جوآن کی زبان خشک تھی۔ اس نے کاؤنٹر سے پلندہ اٹھایا اور چپکے سے جیب میں کھسکا دیا — پلندہ جس کی قیمت ۴۵ سینتاو، ابھی اس کے ذمے تھی — اس نے بینا وائڈز کو خدا حافظ کہا۔ جس کے ہاتھ ابھی تک کانپ رہے تھے اور جس کا رنگ یوں پیلا پڑ گیا تھا گویا اینفلوئنزا کا دورہ پڑ گیا ہے۔

خطرے نے سائمن آرے والو کے بیٹے کا روپ دھار لیا تھا۔ جوآن کو یاد آ گیا کہ سائمن آرے والو اس کا دوست تھا اور اس کا بیٹا لڑکپن میں حقیقتاً کبھی برا نظر نہ آیا تھا۔ وہ تو یوں

ہی اِدھر اُدھر سیاست کے مشغلے پر زبان چلاتا رہتا تھا۔ لیکن اب تک اس نے بنایا کیا ؟ اگر فوج میں بھرتی ہوتا تو معاملہ صاف تھا۔ مگر وہ فوجی وردی بھی تو نہیں پہنے ہوئے تھا جب سے ہنگامہ پروری نے شدت اختیار کی تھی وہ حکام سے گھی کھچڑی ہوا جا رہا تھا۔ قصبے کے باسیوں کا کہنا ہے کہ یا تو وہ صدر قصبہ کے دفتر میں ہوتا ہے یا سپاہیوں کے ساتھ محو نائے د نوش۔ اک مخبر۔ اور مخبر ہی تو وہ تھا۔ اور مخبر بھی ایسا جسے پندرہ پندرہ یا تیس تیس میل کے علاقے کے ہر بسنے والے کے متعلق پوری پوری آگاہی رکھنے کی سبقت حاصل تھی اور ہوتی بھی کیوں نہ ؟ وہ اپنے باپ آرسے دالو اور اپنے دادا کی طرح عین اسی علاقے میں تو پیدا ہوا تھا۔ جوآن کی طرح وہ ننگے پاؤں قریے کے مدرسے میں جایا کرتا تھا اور اسی کی طرح ادھر ادھر علاقے بھر میں گھومتا پھرتا تھا۔ اسے مالکوں، کرایہ داروں، مزارعوں اور مزدوروں کے نام ازبر تھے اور ہوتے بھی کیوں نہ ؟ پھر وہ بڑا ہو گیا اور مندے کی ٹوپی اور جوتا پہننے لگا اور قرب و جوار میں آباد ہو گیا۔ بندوق چلنے کی آواز نے پہلے کارمن کو بیدار کیا اور پھر جوآن کو۔ اور بچہ رونے لگ پڑا۔ روشنی بڑھ رہی تھی اور کمرے کی چیزیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ جب وہ اچھل کر بستر سے باہر ہوا تو اس کا ذہن وقت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ قریباً پانچ بجے تھے۔ فائر پھر سنائی دیئے اور اب کے قریب تر تھے۔ اس نے عجلت میں پتلون پہنی، بیٹی کا بکسوا باندھا اور دروازے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وقت کے متعلق اس کا اندازہ صحیح تھا۔ کھیتوں پر آسمان سے دودھیا روشنی اتر رہی تھی۔ اس نے اندازہ لگائے بغیر دل میں سوچا "پانچ کا عمل ہے اور دن کے نفیس ہونے کی توقع ہے۔" جنگلے کے دروازے کے قبضوں نے کسی کی آمد آمد کا اعلان کیا۔ دو آدمی درانہ گھس آئے۔ جوآن نے انھیں فوراً پہچان لیا ایک آرسے دالو تھا اور دوسرا وہی قمچی والا سپاہی جسے اس نے بنیا وائڈز کی دواؤں کی دکان پر دیکھا تھا۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آرسے دالو کی تنبیہہ مبنی برحقیقت تھی؟ بارہ روز ہوئے جب وہ یہاں آیا تھا۔ ہر چیز عین اس کے کہے کے مطابق پیش آ رہی تھی۔

"ایک ہفتہ — ایک ہفتہ کے اندر اندر یہاں سے تیر ہو جاؤ اور یہ تمھارے حق میں بڑا بہتر ہوگا ورنہ ....." اب آرے والا پھر آدھمکا تھا مگر اس دفعہ قانون بھی ساتھ تھا۔

جب سپاہی جوآن کے قریب آیا تو اس نے ہوا میں ایک دو فائر کر دیئے۔ "مزے کے ہیں، ہیں نا! اور اگر تم یہاں سے چلتے نہ بنے تو کل اسی وقت ڈھیروں اور بھی سنو گے — سمجھے؟" اس نے پھر پستول کا گھوڑا چڑھایا اور تقریباً پتلی پتلی گندم کی بالوں کا نشانہ باندھنے لگا۔ آرے والا سر جھکائے کھڑا تھا۔ جوآن اور کارمن بھاگم بھاگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے کہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اک نظر بھی انھیں نہ دیکھا "تمھیں خاصی تنبیہہ کر دی گئی ہے۔ یہاں سے چلتے بنو اور فوراً چلتے بنو۔" سپاہی نے یہ کہہ کر پستول کو چمڑے کے خانے میں رکھ لیا۔ آرے والو کا ہاتھ پکڑا اور رخصت ہو گیا۔ اب کہیں جا کر جوآن نے محسوس کیا کہ سپاہی کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

ہراک نے اپنا اپنا فرض ادا کر دیا — ادھر قانون اور آرے والو نے اور ادھر جوآن، کارمن اور دودھ پیتے بچے نے! گھر کو آگ باسانی لگ گئی۔ سوکھے گھاس، پرانی لکڑی اور قدیم فرنیچر کے دھڑا دھڑ جلنے کی لاابالیانہ آوازیں تڑاخ تڑاخ آ رہی تھیں دو یا شاید تین گھنٹے مسلسل۔ تازہ شمالی ہوا کے چلنے سے شعلے اور بھی بھڑک اُٹھے تھے اور یہ سب کچھ یوں معلوم ہوتا تھا — جیسے قریے کے چوک میں میلے کا منظر ہو — رومی کلیسا کی عظیم موم بتی یعنی والے سپاہی کی زندگی کا سنہری موقع تھا۔ اس کے ساتھ چار سپاہی بطور گواہ اس بات کی گواہی کے لیے آئے تھے کہ آیا جوآن چپ چاپ چلتا بنا ہے یا مزاحمت کا باعث ہوا ہے۔ وہ آرے والو اور ان چار ساتھیوں سے کہیں بڑھ کر اس آگ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جب وہ قصبے کو واپس ہوئے تو لی نارز کی دکان پر ٹھہر گئے۔ صدر قریہ وہیں اناج کی بوریوں کے ساتھ آرام سے ٹیک لگائے موجود تھا۔

"کیا بنا؟" — "سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا حضورِ والا!" آرے والو نے مختصراً جواب دیا۔

"تو جو اُن خالی کر گیا مکان ؟" سپاہی نے کہا ۔ "نہیں تو عالی جاہ ! ہونق نے تالے ڈالے اور اندر براج گیا۔ اور عالی جاہ! آپ جانیں ہمارے پاس ضائع کرنے کو اتنا وقت نہیں تھا کہ....."

کثیف اور چکیلا تیل میلے ڈرم سے کیف میں اور کیف سے بوتل میں ٹپ ٹپ کر کے گر رہا تھا ۔

عقیدت کی جیت

ضلعے کے سارے مویشی خانوں کو تہذیبِ نو کا بخار چڑھ رہا تھا اور وہ اپنی پہلی قدرتی چراگاہوں والی ہیئت کو کھو رہے تھے۔ جو بے کراں وسعتیں اس وقت تک غیر منقسم پڑی تھیں اب گیاہ زاروں میں ہندسی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھیں — اور تار کے جنگلے انھیں ٹیڑھے ترچھے قطعوں میں بانٹ رہے تھے۔

اب وہ ایسا میدان نہیں تھیں جس کی ہم آہنگ سرسبزی و شادابی افق تک دوڑتی چلی جاتی تھی۔ ان کی شکل و صورت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بدل رہی تھی اور یوں معلوم ہوتی تھیں کہ اُن ٹکڑوں کا سلسلہ ہیں جنھیں آپس میں جوڑ رکھا ہے۔

جب زمین نے دیکھا کہ وہ مفتوح ہے اور اس سے بے اندازہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے تو اس نے ذلت آمیز جد و جہد سے ہاتھ اٹھا لیے اور اپنی بلند کیفیت لامحدودیت سے دست بردار ہو گئی۔

اجنبی قدموں نے تکریم کے بغیر اسے داغدار کر دیا۔ آلات عقوبت نے اسے طویل سیاہ زخموں سے لہولہان کر ڈالا۔ نامعلوم بیجوں نے اس کے زندگی بخش رس سے قوت کو چوس لیا اور لالچی ہاتھوں نے منفعت کی خاطر اس کے خون کی چوری کر لی۔

ایک ہی ٹکڑا رہ گیا تھا جو تبدیلیوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ وان روفی نو کا مویشی خانہ! وان روفی نو نے اس حملہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی بیٹا، ماں کی بے حرمتی کو دیکھے اور اس کا دل سینے میں ڈوب جائے۔

اس کی آنکھ میں آنسو ہوتا اور لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ - اپنی ڈاڑھی ہلاتے ہوئے کہتا "یہ تو کسی امریکی کی پتلون بن گئے ہیں۔" اور اس کی محزوں آنکھیں دھندلا جاتیں اور مختلف رنگوں کو ایک میں تحلیل کر دیتیں۔

اس کا مویشی خانہ ہر قسم کی تبدیلی سے نا آشنا رہا - گائیں، گھوڑیاں اور بھیڑیں یکجا ایک ہی بھیت میں چرتی تھیں اور سبھی خدمت گار وہیں کے باشندے تھے اور جس طرح کوئی جھنڈے کو سنبھالے ہو یہ میدان کے اس آخری ٹکڑے کو سنبھالے ہوئے تھے۔

یہاں وہ حقیقتوں کو بھول جاتے تھے اور اسی بات کا خواب دیکھتے تھے کہ اس کی حدود سے پرے بھی سب کچھ اسی طرح قائم دائم ہے جیسے دس سال پہلے تھا۔ جس طرح غداری کا صدمہ فوری ہوتا ہے ان دس سالوں میں تبدیلیاں بھی فوری ہوئی تھیں۔

اگر پرانے معیاروں سے جانچو تو اس میں واقعی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو مویشی خانے کے مالک میں ہونی چاہئیں۔ وہ دیہات میں پروان چڑھا اور اس کے سارے کاموں کا کاریگر تھا۔ اس کی روح دیہاتی تھی۔ سرتاسر ہمدردی بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عزت کی جاتی تھی اور نیکی کی وجہ سے محبوب خلائق تھا۔

مویشی خانہ پرانے طریقوں پر چل رہا تھا۔ زراعتی سائنس جس طریقہ کار کی حمایت کرتی تھی اسے اختیار کرنا زیادہ نفع بخش ثابت نہ ہوتا لیکن یہ تو جھنڈے کو گرانے کے مترادف ٹھہرتا۔

سیمنٹ کا چھوٹا سا گھر مویشی خانے کے گھروں کی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تین کمرے تھے جو یکے بعد دیگرے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یہاں سے ایک پلاٹیو نظر آتا تھا جس پر گویا بڑی صفائی سے جاروب کشی ہو رہی تھی۔ یہ گھر صریح غربت کا مذاق اڑا رہا تھا۔

اس روز صبح ہی سے چھوٹے گھر پر ڈراؤنے خواب کی مانند حبس چھائی ہوئی تھی۔

چھت کے آتشیں معانقے کے ساتھ ساتھ نیچی دیواریں نہایت تیز جھلسا دینے والی دھوپ کی خیرہ کن سفیدی کا انعکاس کر رہی تھیں۔ پلاٹو کے پار زمین کی درزیں اک ابتری، پراگندگی کا نقشہ لیے ہوئے تھیں۔

چھوٹی سی اولتی کے سایہ تلے دان روفی نو چمڑے کا تسمہ گندھ رہا تھا اور پسینے سے تربتر تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے کام سے تیز نظریں ہٹا کر کھیتوں کو دیکھا جو دھوپ سے جھلس گئے تھے اور گھاس کے نہ ہونے سے چٹیل میدان بن گئے تھے۔ اس کی آنکھیں دھندلائیں اور کھیتوں کی پیلی رنگت کا ارتعاش اس کی نگاہوں کو غبار آلود کر گیا۔

تین مہینوں کی سنگ دل و بے پناہ قحط سالی نے سخت سے سخت جڑوں کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا اور ننگے کھیتوں میں کچھ تھا تو یہی مردار جانوروں کے ڈھانچے جو ادھر ادھر پڑے تھے — تباہی کی مسلمہ تصدیق۔

ڈان روفی نو نے تسمہ لٹکا دیا اور قریبی کنوئیں پر پانی پینے کے لیے چلا آیا۔ اس نے ڈول میں اپنے سر کا نیم حصہ ڈبو دیا۔ پھر وہ دھوپ سے بچنے کی خاطر سوتے کے کمرے میں آ گیا کہ ایک نظر اپنی ننھی اعجاز کن مریم کو بھی دیکھ لے جو ضلع بھر میں مشہور تھی۔

دہلیز سے ادھر قدم رکھتے ہی وہ اک طرح کی تصوف بھری خاموشی سے دوچار تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور تمام خارجی اثرات سے محفوظ تھا۔ دو موم بتیوں نے اسے روشن کر رکھا تھا جو مستغرق مریم کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ اس کے لیے یہ کہنا سخت مشکل تھا کہ مریم کا انداز بخشش کا تھا یا خشوع عبادت کا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے سخت ہاتھ ایک پُرتسکین احترام کے خالق تھے اور ہو سکتا ہے کہ کمرے کی ٹھنڈک جو اس کے سائے تلے اونگھ رہی تھی، اس کے اعجاز کا ہی نتیجہ ہو۔

دونا آنس لی نا نے اس کے لیے منکوں کی ایک چھوٹی سی چٹائی بُن رکھی تھی اور اس کے پیچھے بہت سی کیلوں سے یوں ٹھونک رکھا تھا کہ ایک حلقہ سا بن جائے۔ میگ پائی اور اُلّو

کے انڈوں کی تسبیح بھی لٹک رہی تھی۔

بوڑھا سویں بار جھک کر اُس پانی کے لیے دعا مانگنے والا ہی تھا جس کی انھیں اشد ضرورت تھی کہ اسے اپنی دعاؤں کی بے اثری کا احساس ہو گیا۔

"لکڑی کا یہ بے حس ٹکڑا تو مینڈکوں کی طرف زیادہ متوجہ ہووے ہے۔"

انتقام کی آرزو نے اس کے مقدس ارادے کو ختم کر دیا۔

باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ خشک کھیت — جن میں خاک اڑ رہی تھی۔ جانور — جو زمین کو سونگھ رہے تھے اور خاک بھی نہ پاتے تھے۔ ان کے نتھنوں کی سانس سے مٹی کے دو مینار اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

اس بے بس مخلوق کی ساری مصیبتیں اس کے غصّے کا باعث بن گئیں اور اک مبہم منصوبہ کو ٹھوس شکل مل گئی۔

جب چاروں کھونٹ کی دھوپ سے ہر ایک عذاب میں مبتلا تھا تو اس ننھے بُت کی طرح اس ٹھنڈے کمرے میں غیر ملتفت ہو جانا اک آسان بات تھی۔ "ہماری دعاؤں کو التجاؤں کے ذریعہ نہیں مانا تو قوت سے مان لے۔" اب مناسب یہی ہے کہ جب تک مان نہ لے یہ بھی مصیبت کا مزا چکھتی جائے۔

وقت موزوں تھا۔ لڑکے کھالیں اتارنے گئے ہوئے تھے۔ بڑی بی باورچی خانے میں خارپشت پکا رہی تھی اب وہ اپنی دھمکی کو مداخلت کے بغیر بروئے کار لا سکتا تھا۔

اس نے اک بے ادب ہاتھ بڑھا کر کنواری مریم کو کونے کے تخت سے اتار لیا اور جس طرح وہ چوزے کو اس کی چیں چاں ختم کرنے کے لیے اپنے کرتے میں چھپا لیتا تھا، اسے بھی چھپا لیا اور کمرے میں تالا ڈال کر اس راہ پر ہو لیا جس کی خاک جوتوں میں گھس کر اس کے پاؤں جلائے ڈالتی تھی۔

تیز ہوا کا جھونکا گرے ہوئے پتوں کے مخروطی چکر کو مبتلائے گرداب کر رہا تھا۔ جب وہ آگ

کے لیے چولھے پر جھکتا تھا تو اس کے چہرے کو تپش محسوس ہوتی تھی اسے وہی تپش تیز ہوا کے جھونکے میں موجود ملی تھی۔

وہ اون مونڈنے کے چھپر میں پہنچ گیا جو چوڑی کچی اینٹوں کی عمارت تھی اور چھت گھاس پھوس کی بنی ہوئی تھی۔ اس کے ایک کونے میں کھرلی تھی اور دیوار میں کڑا تھا اور ان دونوں کو ملا کر اس گھوڑی کا اصطبل سمجھ لو جو اس جگہ کی ساکھ تھی۔ مویشی خانے بھر میں یہی ایک جانور تھا جس کی ہڈیوں پر کچھ گوشت نظر آتا تھا۔

اس نے گھوڑی کی پیٹھ پر میشی کی نرم کاٹھی کو پھینکا۔ باگیں ڈالیں اور کاٹھی کو زیر اندازے سے باندھا اور اس پر بیٹھ کر اس چور کی طرح چل پڑا جسے جنگل کے انتہائی گنجان حصے کی تلاش ہو۔

وہ سرپٹ مرغزار کی طرف بڑھا جا رہا تھا اور وہ رہا مویشی داغنے کی چراگاہ کا کھمبا اور صرف یہی تھی اک چیز جسے گرمی مرجھا نہ سکی۔

اس قہر کی جو تفصیل اسے نظر آئی، جلتی پر تیل کا کام کرتی گئی کہ پہلے ہی سورج کی تپش سے اس کا خون کھول رہا تھا اور گرمی کپڑوں کے اندر سے اسے پھونک رہی تھی۔

اس نے گھوڑی کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ وہ جھٹکے کے بغیر ٹھہر جانے کی عادی تھی کرتے کے اندر سے مورتی نکال کر اس پر کافرانہ طمانیت کے ساتھ نگاہ کی۔ اس نے گھوڑی کا زیر بند کھول دیا۔ اور اس بلندی پر جو جانوروں کی پہنچ سے باہر تھی پرو لی تھی اس کی طرح تھی کنواری کو باندھ دیا

جب کام ختم کر چکا تو اپنے کارنامے پر اک نظر دوڑائی کہ کہیں بچ نکلنے کا کوئی امکان تو نہیں۔ جب یقین ہو گیا تو تسلی کا قہقہہ لگایا جس سے چہرے کی شکنیں اور بھی واضح ہو گئیں۔

اس نے گلے میں مسیح کی شبیہہ والا تعویذی فیتہ پہن رکھا تھا۔ اسے چوم کر کہنے لگا "خدا کی قسم جب تک مینہ نہ برساؤ گی اسی کھمبے کے ساتھ جکڑے رہو گی" اور کسی مزید توقف کے

بغیر گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا اور گھر کی راہ لی۔

معاً وہ ٹھہر گیا۔ ایک جذبہ اس کے سینے میں ابھر رہا تھا جسے وہ الفاظ میں بیان نہ کر سکتا تھا۔ دُور افق پر۔ کیا تھا وہ؟ ایک سیاہ لکیر آگے کو حرکت کرتی نظر آتی تھی۔

اسے یقین نہ آتا تھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر دھوکا ہو رہا تھا۔ گھر تو وہ قریباً پہنچ ہی گیا تھا پھر بھی آگے نکل گیا کہ دیکھے بھلا اور لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔

ایک ہی شور تھا جو سننے میں آ رہا تھا۔ "بند کرو دروازے اور کھڑکیاں بند کرو! طوفان آ رہا ہے۔" اور اس کا شک دور ہو گیا۔

اک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر طوفان پہلی بار زمین پر ٹوٹ پڑا۔ سڑک پر خاک و خاشاک کا چکر جنبیاں و لرزاں مینار کی صورت میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ پوپلر کے پُرانے درخت جھکے جا رہے تھے۔ ان کی سربلند چوٹیاں چیخ رہی تھیں اور کے سوار مینا کے پیڑ باریک اور تیز سیٹیاں بجا رہے تھے۔

ڈان رونی تو مسرور سا ہو کر سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے جذبے کے ہاتھوں زمین میں گڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ جو چند جانور اسے نظر آئے، یکساں طور پر، پہلو بہ پہلو آندھی کے رُخ دوڑے جا رہے تھے۔ اسے یوں معلوم ہُوا کہ وہ موٹے ہو گئے ہیں۔ گویا وہ کسی دوسرے عالم میں تھا۔ اسے یہ جان پڑا کہ وہ معجزوں سے مملو ہے اور جب اس نے لمحہ بھر کی کھوئی ہوئی قوت کو پا لیا تو گھوڑے کی گردن پر جھک گیا اور ننھی کنواری کی طرف سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

وہ رہی وہ! سخت گانٹھوں کے ساتھ جکڑی ہوئی۔ ننھی۔ بالکل ویسی کی ویسی۔ تیرگیٔ طوفان میں ذرا کم تاباں۔ ڈان رونی نے اس کے پیرہن لیے، محبت اور پیار کے بول نچھاور کر دیے، اسے نرم کاٹھی میں لپیٹ لیا اور خود ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر گھر کو سرپٹ دوڑ پڑا۔

یوں معلوم ہوتا تھا آندھی سارے جہان کو اپنے آگے بھگائے لیے جا رہی ہے۔ اب تیز تو

تھی مگر شدید نہیں تھی۔ بڑے بڑے قطرے گرنا شروع ہو گئے جو مٹی میں گیند کی طرح لڑھکتے تھے۔ بڑے میاں گیلی مٹی کی باس میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ جب وہ روکنے والے جھکلے کے قریب پہنچا تو قطروں کا حجم بڑھ گیا تھا۔ زمین پر پڑتے تھے تو بلبلے اُٹھتے تھے۔

وہ اندر داخل ہُوا تو شرابور تھا۔

اون مونڈنے کے چھپر میں بھی مصروف تھے اور ہر اس چیز کو چھت تلے لا رہے تھے جس کی بابت احتمال تھا کہ مینہ سے خراب ہو جائے گی۔

اودن پرندہ پر پھٹپھٹا پھٹپھٹا کر اپنی فتح مندانہ مسرت کا اظہار کر رہا تھا۔ بجلی آسمان کے آر پار لحظہ بلحظہ چمک، کڑک رہی تھی۔

فی لائپ سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ وہ پیاڑ کی لکیر کے ساتھ ساتھ مینہ کے ٹھنڈے ٹھار ملّے میں تر بتر گھوڑے پر سوار چیختا چلّاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے کاٹھی کے ساتھ ایک کھال باندھ رکھی تھی جس کے سم گھوڑے کے شانوں کے لیے میز کا کام کر رہے تھے۔ گھر کے قریب آجانے پر مشتعل جانور چاروں پیر جوڑ جوڑ کر بار بار اچھلا کودا۔

"ارے کدھر کو؟ کیا کرت ہو؟ کوئی مصیبت . . . ؟" دان روفی نو نے چلّا کر کہا۔

"بوڑھا ہو رہا ہوں بابا اور بدھو بھی اور ٹٹھوں میں اینٹھن بھی ہے۔" وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

بارش ہوئے ہوئے مدتیں پڑ گئی تھیں سے ننھی ننھی نہریں نہ نکلیں۔ ان سے جو قطرے ٹپک رہے تھے، وہ پہلے قطروں کے نشانوں کو اور گہرا کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر آندھی نے جن درختوں کو تازیانے لگائے تھے وہ وہل دھلا کر نکھر گئے تھے اور ان کے سبز پتے چمک رہے تھے۔ تنوں کا رنگ گہرا پڑ گیا تھا۔

خندقوں نے دریاؤں کو چرا لیا تھا اور جوہڑوں نے جھیلوں کو۔ پرندے پروں کے گیند بنے، ساکت و جامد، اپنے پپوٹوں کو نیم بند کیے استادہ تھے۔ ایک ہلکا ترنم، ایک بھرپور طمانیت چھائی

ہوئی تھی اور گو اندر ہی اندر ان میں شدت تھی مگر لوگوں نے کی حرکتوں کو اعتدال پر رکھے ہوئے تھیں۔ لوگ ٹھنڈی ہواؤں سے اپنی جلدوں کو تھپتھپا رہے تھے۔

سارے میدان سے معانقہ گیر تھا — اک نرم ترنم ایک سکوت استغراق۔

اسی روز رات کے نو بجے۔ چھوٹے مویشی خانے میں ہر چیز محوِ خواب معلوم ہوتی تھی۔ بوڑھے میاں بیوی کی خواب گاہ میں روشنی نظر آتی تھی۔ گھر کی ساری موم بتیاں وہیں جمع ہو کر محسنہ کے لیے نور بکھیر رہی تھیں۔ دان دَدنی نو ہاتھ میں تسبیح لیے "مریم! خوش آمدید" گاتا تھا جس کا جواب سب متحدہ آواز میں دیتے تھے۔

باورچی، کارندے سبھی اس اہم وقت میں جمع تھے۔ ایک گہری یکساں لہجے کی آواز سے وقفے وقفے پر متحدہ آوازیں آتی تھیں ان سادہ روحوں کے دلوں سے نکلا ہوا تقدس تمام فضا میں طاری تھا۔

کھڑکیوں پر مینہ کے تھپیڑے رک رک کر پڑتے تھے۔

ننھی کنواری اپنے طاقچے میں موجود تھی اور اس واقعے سے جو اطمینان حاصل ہوا تھا اس سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اس نے اس فتح نو کی خوشبو کو آس پاس کے سارے ولیوں پر پھیلا دیا تھا۔

ایمیلیا پاردو باثان

سسٹر ایپاری سی یوں

"س"، میں ولی کلیر کی بہنوں کی خانقاہ کی دُہری جالی والی نیچی کھڑکی میں سے مجھے ایک راہبہ نظر آئی جو سر بسجود ہو کر مصروفِ دعا تھی۔ وہ بلند قربان گاہ کے سامنے دراز تھی، منہ فرش کی طرف، تھا، بازو باہر کو پھیلے ہوئے تھے اور جسم قطعاً ساکت۔ اگر وہ زندہ تھی تو اتنی ہی جس قدر اس ملکہ اور شہزادی کے چت پڑے بت زندہ تھے جن کی سیل کھڑی کی بنی ہوئی قبریں گرجے کے مشرقی حصّے کی زینت آرائی کر رہی تھیں۔ وہ معاً اُٹھ کھڑی ہوئی اور یہ حرکت اس نے یقیناً سانس لینے کے لیے کی تھی۔ اب وہ میری نظروں کے سامنے تھی۔ جس طرح شکستہ دیواریں کبھی کا شاندار محل ہوتی ہیں، صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی بعمر سنی میں بہت حسین ہو گی۔ اگر اسے اسّی کا کہیں تو بآسانی نوّے کا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے چہرے کی ——— مردوں کی سی مردنی اس کے لرزاں سر پر چکے منہ اور سفید ابرو سے عیاں تھا کہ وہ اس عمر کو پہنچ گئی ہے جہاں کوئی مرورِ زمانہ کا خیال تک نہیں لاتا۔

اس کے مردہ چہرے میں جو اس دنیا کا نہیں معلوم ہوتا تھا، اک غیر معمولی چیز تھی ——— آنکھیں۔ وقت کو شکست دیتے ہوئے وہ ابھی تک اپنی آگ، اپنی گہری سیاہی اور اک ہیجان خیز اور ڈرامائی اظہار کو محفوظ کیے ہوئے تھیں۔ ان کی اک نگاہ کو ایک دفعہ دیکھ کر عمر بھر بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اُس راہبہ کے پاس جو خانقاہ میں داخل ہو کر خدا کے حضور اپنا معصوم دل پیش کر رہی ہو، ایسی جوالا مکھی آنکھوں کا ہونا اک ناقابلِ توجیہہ بات تھی۔ یہ آنکھیں اک طوفان خیز ماضی کا پتہ بتا رہی تھیں۔ اک حزیں یاد پر روشنی ڈال رہی تھیں۔ اگرچہ مجھے امید یہی تھی کہ راہبہ کے راز سے کبھی

آگاہ نہ ہوسکوں گا، مجھے تجسس کھائے جا رہا تھا۔ بہرحال اتفاقات نے میری آرزو کو قطعاً پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

اُسی شام سرائے کی کھانے کی گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے ایک معمر شریف آدمی سے میری شناسائی ہوگئی جو بہت باتونی اور ہشیار تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جنھیں اپنوں کو معلومات پہنچانے کا شغف ہو۔ وہ میری دلچسپی سے پھولا نہ سمایا اور اپنی بلاکی یادداشت کے دفتر کھول دیئے۔ میں نے ابھی ولی کلیر کی خانقاہ کا ذکر اور اس تاثر کا اظہار ہی کیا تھا، جو بوڑھی راہبہ کی آنکھوں نے میرے دل پر چھوڑا تھا کہ وہ پھٹ پڑا۔ "آہ سسٹر ایپاریسی یوں! جی، جی ہاں، واقعی اس کی آنکھوں میں ہے سہی کچھ نہ کچھ۔ ان میں اس کی سوانح حیات لکھی پڑی ہے۔ یقین جانئے اس کے آنسوؤں نے اس کے گالوں کی اُن شکنوں کی آبیاری کی ہے جو قریب سے دیکھنے پر نہر معلوم ہوتی ہیں۔ چالیس سال اشک ریز رہی ہیں۔ اس دوران میں ڈھیروں ہی اشک بہ گئے ہوں گے لیکن ان کا پانی اس کی آنکھوں کی چنگاریوں کو مدھم نہ کر سکا۔ بیچاری سسٹر ایپاریسی یوں! چونکہ میرا باپ اسے لڑکپن سے ہی جانتا ہے اور میں باتوں باتوں اس نے اس سے تھوڑا بہت معاشقہ بھی کیا ہوگا۔ سو مجھ سے بہتر بھلا اور کون اس کی زندگی کی کہانی بیان کرسکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ ایک دیوی کی مثل تھی۔

"راہبہ بننے سے پہلے اسے آئے ریس کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کے والدین نیک خاندان کے افراد تھے اور گاؤں میں مانی ہوئی حیثیت کے مالک۔ ان کے بہتیرے بچے ہوئے مگر سب مرگئے اور یہی تنہا رہ گئی جس پر ان کی ساری محبت اور ناز برداری مرکوز تھی۔ تھا وہ قصبہ جہاں پیدا ہوئی تھی اور تقدیر کی رضا یہی تھا کہ یہی قصبہ مشہور شاعر ـــــ کی جنم بھومی بھی ٹھہرے، تقدیر جو ہمارے پنگوڑے کی چاروں سے ہی اس رسّے کو بٹنا شروع کردیتی ہے جس سے ہمیں پھانسی دینا ہوتی ہے۔"

میری چیخ نکل گئی اور داستان گو کے منہ سے الفاظ نکلے بھی نہ تھے کہ "زوال زدہ فرشتۂ عظیم

کے مصنف کا جلیل القدر نام پکار دیا جو شاید رومانی حدت کا صحیح ترین نمائندہ تھا، جس کے نام کے ایک ایک حرف میں تذلیل کن تکبر۔ تحقیر کن تنفر۔ تلخ طعن و طنز اور مایوس کن اور کفر آمیز یاد وطن کے ھڑکے کی دھار موجود تھی۔ گو ابھی تک مجھے ان دونوں کے تعلق کا کوئی سلسلہ معلوم نہیں تھا۔ راہبہ کی نظر اور یہ نام میرے تخیل میں گھل مل گئے تھے اور ان دونوں کے اختلاط سے مجھے پہلے ہی اس ڈرامے کا کھیل سوجھ رہا تھا، جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور جس سے دل کا لہو بہا کرتا ہے۔

اطلاع دینے والے نے دہرا کر کہا۔ "وہی ہے وہی۔ شہرہ آفاق جوآن ڈی۔ کمارگو — گاؤں کو اس کی ذات پر ناز تھا۔ اس گاؤں میں معدنی چشمے نہیں تھے۔ معجزے کرنے والا پیر نہیں تھا۔ کوئی عظیم گرجا نہیں تھا۔ رومن زمانے کے کتبے نہیں تھے۔ غرض یہاں کوئی ایسی دلچسپی کی چیز نہیں تھی جو باہر سے آنے والوں کو دکھائی جاتی لیکن اس پر بھی گاؤں نہایت فخر سے اپنے چوک کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ "یہی ہے وہ گھر جہاں کمارگو پیدا ہوا تھا۔"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آہ، اب سمجھا! سسٹر لیپاری سی یوں یعنی آئے رین کمارگو سے محبت کرتی تھی، جس نے بے اتفاقی کی اور وہ خانقاہ میں داخل ہو گئی کہ بھول جائے —"

راوی نے مسکرا کر کہا۔ "ذرا ٹھہریئے صاحب! اگر اس قصے میں لے دے کے یہی کچھ تھا تو یہ روزمرہ کا اک واقعہ ہوا اور بیان کرنے کی زحمت کے لائق کیوں ہونے لگا — سسٹر لیپاری سی یوں کے قصے میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ صبر کیجیے تو سب کچھ سن لیجیے گا۔"

آئے رین نے اپنے بچپن میں کمارگو کو ایک نہیں ہزاروں بار دیکھا تھا، لیکن آپس میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی کہ وہ جوان ہو بھی چکا تھا اور یہ ابھی بچی تھی۔ وہ تنہا اور الگ تھلگ رہتا تھا، اس نے گاؤں کے لڑکوں سے بھی کوئی سروکار نہ رکھا تھا۔ جب آئے رین بہار شباب میں قدم رکھ رہی تھی تو یتیم کمارگو سالامانکا میں قانون پڑھ رہا تھا۔ وہ چھٹیوں کے دوران

اپنے سرپرستوں کو ملنے کے لیے صرف ایک دفعہ گاؤں آتا تھا۔ گرمیوں کا ذکر ہے کہ وہ آ کو لوٹ رہا تھا۔ اتفاقاً طالب علم کی نظریں اٹھیں اور آئے رین کی کھڑکی پر پڑ گئیں۔ وہاں اس نے لڑکی کو دیکھا جس کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نظریں جو آدمی کا دل سینے سے اڑا لے جائیں! دوسیاہ سورج آپ دیکھ ہی چکے ہیں کہ ابھی تک وہ کس شئے کی مانند ہیں! کمار گو نے کراتے کے گھوڑے کی باگ کھینچ لی کہ اس حیرت زا حسن سے جی بھر کر سیر ہو لے۔ لیکن لڑکی کا چہرہ کو کنار پھول کی طرح قطعاً اٹھا کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور اسے زور سے بند کر دیا۔ کمار گو نے اپنی نظمیں قلیل المیعاد ادبی رسالوں میں چھپوانا شروع کر دی تھیں۔ اس رات اس نے اک حسین نظم کہی جس میں اس نے اُس اثر کو بیان کیا تھا جو گاؤں میں داخل ہوتے وقت اس کے دل میں آئے رین کی دید سے پیدا ہوا تھا۔ جب رات ہو گئی تو اس نے اسی کاغذ کو جس پر یہ نظم لکھی تھی، ایک پتھر پر لپیٹا اور آئے رین کی کھڑکی پر دے مارا۔ شیشہ ٹوٹا اور لڑکی نے کاغذ اُٹھا لیا۔ اس نے نظم کو ایک نہیں سینکڑوں نہیں ہزاروں بار پڑھ ڈالا۔ وہ اسے انتہائی ذوق و شوق سے پڑھتی رہی۔ اس میں جذب ہو گئی۔ مزے کی بات ہے کہ یہ نظم جو کمار گو کی تصنیفات کے مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ اعلان محبت نہیں تھی بلکہ افسوس اور کوسنوں کا عجیب سا مرکب تھی۔ شاعر اپنے آپ کو مردود کہہ رہا تھا کہ اس کے نصیبوں میں دریچے والی لڑکی کی پاکدامانی اور خوبصورتی نہیں ہے اگر وہ اس ملی کے قریب آجاتے تو اس کا رس چوسے بغیر نہ چھوڑتے۔ اس نظم کے واقعے کے بعد کمار گو سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوئی جس سے پتہ چلتا کہ اسے اک ایسا شخص بھی یاد ہے جسے آئے رین کہتے ہیں۔ وہ اکتوبر میں میڈرڈ روانہ ہو گیا جہاں اس کی زندگی کے پُرجوش حصے کا آغاز ہو گیا تھا جو اس کی ادبی سرگرمیوں اور سیاسی معرکوں پر مشتمل تھا۔

جس دن سے کمار گو گیا تھا، آئے رین روز بروز غمگین ہوتی جا رہی تھی۔ وہ سچ مچ بیمار ہو گئی۔ اس کے والدین نے اس کی طبیعت کو بحال کرنے کے لیے اپنے مقدور بھر سب کچھ کر

ڈالا۔ وہ کچھ عرصے کے لیے اسے باداجوزنے گئے۔ اس کے لیے انھوں نے نوجوان لڑکوں کی صحبت اور رقص و سرود کو عام رکھا۔ اس کے مداح بھی تھے اُن کی تعریفیں بھی تھیں جو اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ لیکن نہ اس کی طبیعت بحال ہوئی اور نہ صحت بہتر۔

وہ رات دن کمارگو کے تصور میں غرق رہتی تھی۔ بائرن نے جو لارا کے متعلق کہا تھا وہی کمارگو پر بھی صادق آتا تھا کہ جنھوں نے اسے دیکھا ہے ان کا دیکھنا لاحاصل نہیں۔ خود آتے رین کو بھی یہی خیال تھا کہ وہ شک میں مبتلا نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس عجیب عجیب اور اداس اداس نظم میں کوئی جادو تھا جس کا وہ نشانہ بن چکی ہے۔ لاریب کہ وہ اس چیز کی گرفت میں تھی جسے آج کل تسلطِ وہم کہتے ہیں۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے کمارگو موجود تھا۔ زرد رُو۔ کھٹور اور اپنی متفکر پیشانی پر گھنگریالے بالوں کا سایہ لیے ہوئے۔ جب آتے رین کے والدین نے دیکھا کہ ان کی بیٹی کسی پُراسرار مرض سے گھل جا رہی ہے تو انھوں نے اسے دارالخلافے میں لے جانے کی ٹھانی جہاں بہترین ڈاکٹروں کے مشوروں کے میسر ہونے کے علاوہ کئی دل بہلاوے بھی ہوں گے۔

آتے رین کے میڈرڈ پہنچنے تک کمارگو اک مشہور شخصیت بن گیا ہُوا تھا۔ اس کے خودسرانہ آتشیں، ہیجان خیز اور برق آسا شعروں نے نقادوں کا اک مدرسۂ فکر پیدا کر دیا تھا۔ اس کے معرکے اور کارنامے لوگوں کے موضوعِ سخن تھے۔ وہ ایسے لوگوں کے گروہوں میں گھرا ہُوا تھا۔ جو شیطان صفت، بذلہ سنج، بے پروا اور لاابالی تھے۔ وہ ہر رات کوئی نہ کوئی خرمستی ایجاد کر لیتے تھے۔ کبھی شہر کے شرفا کے آرام میں مخل انداز ہوتے تھے اور کبھی شراب و کباب کی بدمستی سے بھرپور مجلسیں بپا کرتے تھے۔ جن کا ذکر چند اخلاق سوز اور ملحدانہ نظموں میں موجود ہے اور کئی نقاد مصر ہیں کہ یہ نظمیں حقیقتاً کمارگو کا نتیجۂ فکر نہیں ہیں۔ شرب و سرور کی محفلیں اور اوباشی بھرے جلسے، فراموشوں کی نشستیں اور باغیانہ بسہائیں باری باری منعقد ہوتی تھیں۔ کمارگو اپنے جلاوطن ہونے کی راہ کو پہلے ہی ہموار کر رہا تھا۔ آتے رین کے والدین دیہات کے سادہ دل

لوگ تھے۔ انھیں ان چیزوں کی قطعاً خبر نہ تھی۔ بازار میں شاعر سے ان کی ملاقات ہوئی تو وہ اس سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے کہ بالآخر وہ اپنے گاؤں ہی کا تھا۔

کمارگو لڑکی کے حسن کو دیکھ کر پھر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے غور سے دیکھا کہ اس کی ملاقات سے آئے ریں کے خوب صورت اور زرد گالوں پر پھر سے سرخی دوڑ گئی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتا گیا اور رخصت ہوتے وقت وعدہ کرتا گیا کہ پھر کسی وقت ان کے پاس ملاقات کے لیے آئے گا۔ یہ بچارے گاؤں کے بھولے باشی اس کی توجہ سے بہت خوش تھے۔ حسبِ وعدہ وہ ان کے یہاں آتا رہا۔ کچھ روز بعد آئے ریں کے منہ پر رونق آگئی۔ اس سے والدین بے حد مطمئن ہوئے۔ انھیں خاک بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے نام کے ساتھ کیا کیا فضیلتیں وابستہ ہیں۔ انھیں خیال سا ہوا کہ ممکن ہے یہی ہمارا داماد ٹھہرے۔ انھوں نے اسے آمد و رفت کی کھلی اجازت دے رکھی تھی۔

آپ کے چہرے سے ترشح ہے گویا آپ اپنے خیال میں اختتام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہی آپ کی بھول ہے آئے ریں اس کی اتنی بُری طرح سے گرویدہ ہو گئی تھی جیسے اس نے کوئی جادو کا شربت حُب پی لیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود چھ مہینے سے وہ اس کے یہاں جانے سے انکار کرتی رہی۔ لڑکی کی مقدس مدافعت نے اسے اپنے دوستوں کا نشانۂ تضحیک بنا دیا۔ اس نے ایک ابلیسانہ و سفاکانہ انتقام کی شرط لگالی اور یہ شرط اس نے اپنے غرور کی خاطر لگائی۔ وہ غرور جو بعض رومانوی پہلوؤں کا زہر آلود سرچشمہ ہوتا ہے۔ دیکھنا چاہیں تو آپ بائرن اور کمارگو کا غرور بھی دیکھ لیجیے۔ اس نے دلیل بازی سے کام لیا۔ پھسلایا۔ سرد مہر ہو گیا۔ جذبۂ رقابت بیدار کیا۔ خود کشی کی دھمکی دی۔ الغرض اسے قابو میں لانے کے لیے ہر ایک طرح کا جال بچھایا۔ وہ بے بس ہو گئی۔ آخر اس نے اس سپردگی کا وعدہ کر لیا جو خطرناک تھی۔ جرأت اور شائستگی کے معجزہ کی نوازش! کہ وہ پاک صاف اور بے داغ لوٹ آئی۔ کمارگو کا وہ وہ مذاق اڑا کہ مارے غصّے کے آپے سے باہر ہو گیا۔

دوسری ملاقات کے وقت اس کی طاقت نے جواب دے دیا۔ اس کی قوتِ ارادی

جھک گئی ۔ وہ مغلوب ہو گئی اور جب پریشان و لرزاں، آنکھیں بند کیے وہ اپنے ملعون عاشق کے بازوؤں میں پڑی تھی، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا ۔ اور اس نے پردے کی ڈوریاں کھینچ دیں آئے ریٹن کیا دیکھتی ہے کہ آٹھ دس نوجوان ہوسناک نظروں سے یوں دیکھ رہے ہیں گویا اسے کھا جائیں گے۔ وہ طنز کے طور پر ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے ۔

وہ لپک کر اٹھی اور سنورے بغیر پریشاں بالوں اور عریاں شانوں کے ساتھ سیڑھیوں سے دھم بازار میں آ کودی ۔ وہ گھر اس حالت میں پہنچی کہ اس کے پیچھے پیچھے شریر لڑکوں کا گروہ تھا جو اس پر کیچڑ اور پتھر پھینک رہا تھا ۔" اسے کیا ہوا اور وہ کہاں رہی ؟ " یہ بتانے سے اس نے قطعاً انکار کر دیا ۔ یہ بات میرے باپ نے اس شخص سے سنی تھی جسے وہ اتفاقاً جانتا تھا اور جو اُن میں تھا جن کے ساتھ کمسار گو نے شرط لگائی تھی ۔ اسے سرسام ہو گیا جس سے اس کی جان کے لالے پڑ گئے ۔ جب تندرست ہوئی تو خانقاہ میں داخل ہو گئی جو اسے خاصی دور تھی ۔ اس کی توبہ و استغفار کے طریقوں سے ننوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ۔ تحیر کن روزے ۔ روٹی میں راکھ کی ملاوٹ ۔ تین تین دن پانی کی بوند چکھے بغیر چلنا ۔ سردیوں کی راتوں میں ننگے پاؤں اور گھٹنوں کے بار مصروفِ عبادت رہنا ۔ اپنے آپ کو کوڑے مارنا ۔ گردن میں کڑا ۔ کنٹوپ کے نیچے کانٹوں کا حلقہ کر کے گرد کیلوں والی پٹی .....

اس کے رفیق اسے ولی سمجھتے تھے ، جس چیز نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ اس کا گریۂ مسلسل تھا ۔ ممکن ہے یہ افسانہ سا ہی ہو مگر کہتے ہیں کہ ایک بار اس نے آنسوؤں سے سلفچی بھر دی تھی ۔ ایک دن معاً اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں ان میں ایک بھی آنسو نہ رہا لیکن رہیں درخشاں اور ان کی درخشانی آپ دیکھ ہی چکے ہیں ۔ بیس سال سے اُوپر گزر چکے ہیں اس واقعہ کو ۔ پارسا لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عفو خداوندی کی نشانی ہے تاہم سسٹر ایپاری سی یوں کو اپنے معاف ہونے کا یقین نہیں ۔ جبھی تو وہ اس بڑھاپے میں بھی روزے رکھتی ہے ، سربسجود رہتی ہے اور اپنے آپ کو کوڑے مارتی ہے ۔

مَیں نے کہا ۔" اس کی توبہ و استغفار دو کے لیے ہے ۔" اور حیران تھا کہ واقعہ نگار کی فہم و فراست اس بات کو گرفت میں لینے سے قاصر کیوں رہی ہے ۔" کیا تمھیں خیال ہے کہ سسٹر ایپاری سی یوں کمارگو کی نامبارک روح کو بھول گئی ہے ؟"

پیو باروخا

خاکِ زرخیز

قصبے کے مضافات میں شاہراہ کے بائیں طرف ایک پرانا یک منزلہ مکان واقع تھا، جس کی سیلن زدہ تاریک دیواروں پر بڑے بڑے سیاہ حروف میں مندرجہ ذیل عبارت بڑی شان سے نظر آتی تھی۔

پلے سیڈرو کی شراب کی دوکان

جس فنکار نے ان الفاظ کو لکھا تھا وہ ان کے دائروں کے نازک پیچ و خم سے مطمئن نہیں تھا اور گوتے سبقت لے جانے کی کوشش میں اس نے فراخ دروازے کی اوپر کی چوکھٹ پر ایک لمبے لمبے اور گنجان پروں والے مرغے کی تصویر بنادی تھی جس کے دونوں پنجے ایک خون آلودہ دل میں گڑے ہوئے تھے جس میں ایک بے رحم تیر پیوست تھا۔ یہ تصویری تحریر ایک راز تھا جس کا مطلب معلوم کرنے کے لیے ہم آج تک قاصر رہے ہیں۔

گھر کی چوڑی ڈیوڑھی کے آمنے سامنے کی دیواروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے پیپوں کی قطار لگی ہوتی تھی، جس سے آنے جانے کا راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ یہ راستہ دوکان کو جاتا تھا جہاں شراب کے علاوہ۔ چاکلیٹ۔ تمباکو۔ لکھنے پڑھنے کا سامان اور دوسری بے شمار چیزیں بکتی تھیں۔ مکان کے پچھواڑے انگور کی بیلوں کے سایوں تلے کئی میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں ہر اتوار کو بعد از دوپہر باخوس دیوتا کے پجاری جمع ہو کر شراب و شغب سے جی بہلاتے تھے اور وینس دیوی کے پرستار عشبہ سے جگر کی آگ بجھاتے تھے۔

شراب کی دکان کی مالکہ جسٹا کی ہمت سے کام کاج خاصہ نفع بخش ہو سکتا تھا مگر اس کا کیا کیجیے کہ اس کا خاوند کابل، فضول خرچ اور نکمّا واقع ہوا تھا اور جو خالص و نما خالص شرابیں وہ کاؤنٹر پر بیچتی تھی ان کا رسیا ہوتے کے علاوہ انڈالشی نسل کے پالتو سانڈ کی ساری صفتوں سے متصف تھا!

اس کے دوست کہتے۔

"ارے یار پلے سیڈو! پھر وہی حال کر دیا تم نے بیوی کا! ارے کم بخت یہ کر کیسے ڈالتے ہو تم؟"

"لو بھئی! بھلا میرا اس میں کیا قصور؟ تم جانو بھیا، یہ جو عورتیں ہیں نا، سورنیاں ہوتی ہیں سورنیاں! اور ہماری اپنی بیوی۔ سو لو ذرا پہچمنی چاہیے اس تک ابھی میں تیاری ہی کر رہا ہوتا ہوں کہ وہ رہی، امید سے! اچھی زمین، اچھے بیج، اچھا موسم....!"

جب بیوی سنتی تو چلا اٹھتی —

"ارے ناہنجار، سؤر! کام پر کیوں نہیں جاتا تو؟"

"کام۔ کام بڑ.... کام — ان عورتوں کو تو اور کوئی بات ہی نہیں سوجھتی۔"

جنوری کے مہینے کا ذکر ہے کہ ایک دن پلاسیڈو نشہ میں دھت، دریا میں گر پڑا۔ دوستوں نے اسے ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا، مگر جب گھر پہنچا تو پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے بستر پر لٹا دیا گیا کہ غریب کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ بیماری کی حالت میں جو بھی "زارت ذی کو" اسے یاد تھے، زور سے گا گا کر پڑھنا رہا! ایک روز صبح کے وقت گاؤں کا ڈھولچی دکان میں آ نکلا۔ اسے پاس بلا کر کہنے لگا۔

"شوبین! ذرا بانسری اور ڈھول تو ادھر لائیو!"

"ابھی لایا"

اسے پلاسیڈو بھلا لگتا تھا۔ اس لیے ڈھول اور بانسری لا کر کہنے لگا۔

"ہاں بھیّا! کونسی چیز پسند کرو گے؟"

"آرسس کو"۔

ڈھول والا اس کے نصف تک پہنچا ہوگا کہ پلاسیڈو مڑ کر بولا۔

"بس بھیا بس اب اس کا آخری حصّہ کہ ہمارا وقت بھی آخر ہے!"

اور پلاسیڈو نے منہ دیوار کی طرف کر لیا اور دم دے دیا!

دوسرے روز گورکن پاشی نے اپنے دوست کے لیے ایک نفیس آرام دہ اور تین فٹ گہری قبر تیار کی۔ دکاندار جیٹا اُمیّد سے تھی اور اپنے سات بچوں اور دکان کی خاطر جدّوجہد کیے چلی جا رہی تھی۔ اس کے خاوند کے دوست نصیحتوں سے اس کی امداد کر رہے تھے۔

پاشی ذرا یا پاشی شیطان ان سب سے بڑھ کر وفادار ثابت ہوا۔ پاشی اگر موٹا نہ ہوتا تو خاصہ لمبا تھا۔ اگر پشت پر نگاہ کرو تو چوڑا چکلا تھا اور جو سامنے کی طرف دیکھو تو پھولی ہوئی توند کی وجہ سے گول مٹول نظر آتا تھا۔ اس کے ملائم حجامت شدہ چہرے کا رنگ سرخی مائل بنفشئی تھا اور اس کی چمکیلی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چہرے کے موٹاپے میں ڈوبی سی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ناک یونانیوں کی سی نہیں تھی پر جو یہ اتنی بڑی اور چوڑی اور سرخ نہ ہوتی تو اس کے خوبصورت ہونے میں کلام نہیں تھا گو اس کے منہ میں دانت نہیں تھے مگر اس کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ اس کے لب بے پناہ مسکراہٹ کے موجب تھے۔ اس کی پلیٹ جتنی بڑی ٹوپی بہترین خوش مذاقی کا مظہر تھی اور کسی حالت میں بھی اس کے سر سے جدا ہونے کی تلخی کو گوارا نہیں کرتی تھی۔

بے فکروں نے اس کی ذات کے متعلق کئی گپّیں اڑا رکھی تھیں کوئی کہتا تھا وہ اپنے زمانۂ شباب میں انتہائی دہشت پسند تھا اور جب شمالی ریلوے کی پٹڑی بچھائی جا رہی تھی تو وہ لارائے ادجا کے مقام پر اک عام قسم کی بندوق کے زور سے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا۔ کسی کا کہنا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے بحری جہاز کے عملے میں شامل ہو کر لوٹ مار کیا کرتا تھا اور یونہی بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے کہ اس نے گورکن کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا اور مردہ

بچوں کی چرب زبی جمع کیا کرتا تھا۔ مگر ہم حقیقت کے احترام کے سلسلے میں نہایت عجلت سے عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ سب مفروضے سچائی سے کوسوں دُور تھے۔

جب پاشی امریکہ میں کافی عرصہ ٹھہرنے کے بعد اپنے گاؤں کو لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کا وہ قطعۂ زمین جو پہاڑی کے دامن میں واقع تھا، اک قبرستان بن گیا ہے ـــــ گاؤں میں یہی مشہور ہو چکا تھا کہ پاشی مر گیا ہے۔ پاشی نے گاؤں کی منتظمہ سے اپنی زمین کے ٹکڑے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ منتظمہ نے اسے زمین کی قیمت دینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ مگر پاشی نے کہا کہ میں اپنی زمین منت نذر کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ گورکن کا کام میرے سپرد کر دیا جائے اور اک قبرستان کے کونے میں دیوار کے قریب عمولی جھونپڑی کی تعمیر کی اجازت مل جائے جہاں میں اپنی ٹوپی اور پائپ کے ساتھ سکون سے زندگی گزاروں۔

اجازت ملنے پر اس نے جھونپڑی تعمیر کر دی اور اسی میں اُٹھ آیا اور قبرستان کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا۔ مُردوں کو پاشی سے کوئی شکایت نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ان کی قبروں کو خوشبودار پھولوں اور بیلوں سے ڈھانپے رکھتا تھا۔

اتنا اچھا کام کرنے کے باوجود گاؤں کے لوگ اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ اکثر اوقات عشائے ربانی کی نماز میں شریک ہونے سے گریز کیا کرتا تھا اور جب پادری کی تعریف سنتا تو آنکھ مار کر بسکانی زبان میں کہتا "تمھیں خوب جانتا ہوں استاد!" لوگ معاندانہ طور پر اس کے اس فقرے سے یہ سمجھتے تھے کہ وہ اک ایسی افواہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ پادری کسی نزدیک کے گاؤں میں دو تین بچوں کا کنوارا باپ بن چکا ہے اور سچ پوچھیے تو اس افواہ میں کچھ نہ کچھ شائبۂ حقیقت بھی ضرور تھا۔

پاشی نے گاؤں میں اتنی دہشت پھیلا رکھی تھی کہ جب بچے ماؤں کے کہنے میں نہ آتے تو وہ کہتیں "اگر چپکے نہ بیٹھو گے تو پاشی شیطان آ کر تمھیں اُٹھا لے جائے گا۔"

پاشی گاؤں کے امیروں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور وہ اساز جو اپنے آپ کو بذلہ سنج

سمجھے ہوئے تھا اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔

پاشی اور نوجوان ڈاکٹر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ جب مردے کی چیر پھاڑ کرنی ہوتی تھی تو گورکن ڈاکٹر کا ہاتھ بٹاتا تھا اور اگر کبھی کوئی راہگیر اس "تماشے" کو قریب سے دیکھنے کے لیے میز کے پاس آکر کراہیت یا خوف کے مارے الٹے پاؤں چلا جاتا۔ تو پاشی ڈاکٹر کو آنکھ مار دیتا، گویا کہہ رہا ہو۔ "دیکھا نا ڈر گیا کہ رازِ درونِ پردہ سے آشنا نہیں ہے۔ ہا! ہا! ہا!۔"

لوگ پاشی کو بُرا بھلا کہتے تھے مگر وہ ان کی باتوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ پاشی جٹا کے مے خانے کی محض کا گھنا تھا اور یہی بات اسے دل سے پسند تھی۔ اس کے سامعین بھی ملاحظہ کر لیجیے۔ سڑک مرمت کرنے والا۔ ایک آزاد خیال مخبر۔ چھوٹا مجسٹریٹ، جو مجسٹریٹ بننے سے قبل چلیں بنایا کرتا تھا۔ ڈان رامون جو کسی زمانے میں سکول ماسٹر تھا اور اب اپنے کھانے اور شراب کی بوتل کے ساتھ ہر شام کو مے خانہ میں پہنچ جاتا تھا۔ ڈھول والا۔ فارم کے دفتر کا ملازم اور بہتیرے دوسرے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاشی کی مزے دار باتوں کی کشش ان سب کو کھینچ لانے کا باعث تھی۔ جب چھلاوے کا ذکر اذکار چل نکلتا تو کہتا۔ "بھلا اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہے ہی بجلی کا کرشمہ۔" یہ سُن کر سامعین ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے گویا پوچھ رہے ہیں "یہ کیوں بھئی اس کی وزنی بات کی اہمیت سمجھ میں آگئی!"۔

پاشی جملے گھڑا کرتا تھا اور یہ وہ چیز تھی جو بڑے بڑے ادیبوں کو بھی شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی ہے! اور بعض دفعہ ایسے ایسے نظریے پیش کرتا جو لاینحل کو زیادہ زیب دیتے ہیں۔ اس کی ساری فلاسفی کا لب لباب ان الفاظ سے عیاں ہے جو وہ اکثر کہتا تھا۔ "آدمی پودوں کی مانند ہیں۔ چونکہ انھیں پیدا ہونا پڑا ہے اس لیے وہ پیدا ہو گئے ہیں۔ بعض پودوں میں سرخ پھول لگتے ہیں اور بعض میں زرد۔ اسی طرح بعض لوگ اچھے ہیں اور بعض بُرے! لیکن آدمی پیدا وہی ہوا ہے جو شرابی ہوا!"

وہ گھونٹ بھر پانی پیتا اور یوں منہ بناتا گویا کوئی تلخ چیز حلق سے اتری ہے اور اس کی تلخی کو زائل کرنے کے لیے غٹ غٹ کر کے برانڈی کا بڑا سا گلاس پی جاتا۔ وہ برانڈی کے بہت بڑے گلاس کے ساتھ ساتھ پانی کے چھوٹے سے گلاس کا آرڈر دیا کرتا تھا۔ مذاقاً!

جواب دینے میں وہ لاجواب تھا۔ ایک روز کوئی زردار کان کن ادھر آنکلا اور شاید اپنے آپ کو یوسف ثانی سمجھتا تھا کہ لگا اپنی فتوحاتِ عشق کی بڑ ہانکنے! "ایک بچہ اولاً بالی چھوڑ آیا ہوں، ایک زوبی اڑتے میں اور ایک گرتی لو میں۔"

پاشی سے رہا نہ گیا سنجیدگی سے کہنے لگا۔ "ارے میاں! یقین بھی ہے تمھیں کہ تمھاری بیوی کے بچے، تمھارے ہی تھے کیا؟"

جب پاشی اپنے امریکی قیام کے قصے سناتا تھا تو پائپ کا دھواں اس کی سرخ ناک کو گرما دیتا تھا اور لفظ لفظ پر تحسین کی تالیاں بجتیں اور قہقہے بلند ہوتے تھے! اس کے امریکی قیام والے تجربے بڑے بڑے دل کش تھے۔ وہ وہاں جواری بھی رہا تھا۔ دکاندار بھی، کھیت کا کارندہ اور فوجی بھی اور نہ جانے اور کیا کیا کچھ!

ایک دفعہ اسے فوجی کی حیثیت میں چند قدیم امریکیوں کو زندہ جلانا پڑ گیا تھا۔ لیکن پاشی نے جو مجبتیں کالوں، بھوروں اور زردوں سے کی تھیں جب ان کے افسانے بیان کرتا تو سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے۔ مبالغہ آرائی کے خوف کے بغیر اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اس کی طبع بڑی رنگین رہی ہے۔

مے خانے کی مالکہ ان عورتوں سے تھی جو کام کاج کے بغیر ایک منٹ بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتیں۔ اپنا آٹھواں بچہ جننے کے دو روز بعد ہی وہ یوں اپنے فرائض انجام دے رہی تھی گویا کچھ ہوا ہی نہیں! مگر اسی رات اسے بخار آگیا اور بخار بھی ایسا جس نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور غریب کو قبر میں پہنچا کر دم لیا۔

چونکہ کافی مقروض تھی اس لیے مے خانہ بیچ دیا گیا اور بیچارے بچے سڑک پر آ رہے!

میئر نے کہا "ان بچوں کے لیے تو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے!"

"لازماً ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔" پادری نے بڑے شیریں لہجے میں کہا اور آسمان کو تکنے لگا۔

دوا ساز نے بڑے عزم سے کہا "اب باتوں کو چھوڑیئے اور ان بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیجیے!"

قصبے کے کلرک نے کہا "بچے..... خیرات!"

اور دن اور ہفتے گزرتے گئے! سب سے بڑی لڑکی ڈائیکے کے گھر کا کام کاج کرنے لگی اور وہاں وہ مطمئن بھی تھی اور نومولود بچی کو لوہار کی بیوی نے، عین اپنی مرضی کے خلاف، چھاتی سے لگا لیا!

اور باقی کے چھ شوبین۔ شنتی۔ مارتی۔ جوشے۔ ماری اور گاسپر سڑک پر ننگے پاؤں دوڑ دوڑ کر بھیک مانگتے پھرتے تھے!

ایک روز صبح کے وقت گورکن گاؤں میں اپنا چھکڑا لے کر آیا اور ان چھوٹے ننھے منّوں کو اس میں لاد دیا اور نومولود ننھی کو گود میں اُٹھا لیا اور راہ میں دوا ساز کی دکان سے دودھ پلانے والی بوتل خرید کر سیدھا اپنی جھونپڑی میں سارے ساز سامان کے ساتھ پہنچ گیا۔

میئر نے کہا "دکھاوا!"

دوا ساز بڑبڑایا "احمق!"

پادری اتنی بڑی کلفت و فلاکت کو دیکھ نہ سکا اور آسمان کو تکنے لگا۔

قصبے کے کلرک نے پیش گوئی کی "وہ اک اک دن ان کا ساتھ چھوڑ رہے گا!"

پاشی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ وہ ان کی پرورش میں مصروف ہے! چونکہ کھانے رلے بہت ہیں۔ اس لیے اس نے شراب چھوڑ دی ہے اور قبرستان میں بھونڈے طریقے سے سبزیاں بوتا ہے۔ اب گاؤں میں باقاعدہ منڈی کھل گئی ہے اور جس دوست کے کھیت قبرستان

کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوتے ہیں وہ وہاں اپنا مال فروخت کرنے کے لیے لے جایا کرتا ہے۔ پاشی نے اسی دوست کے ساتھ معاملہ طے کر لیا ہے کہ وہ اس کے کرم کلے اور ہاتھی چوک بھی وہیں بیچ آیا کرے۔

پاشی کے دوست کے کرم کلے جو درحقیقت قبرستان کی پیداوار ہیں۔ گاؤں کی منڈی میں اپنی خوبی اور لذت کی وجہ سے بہت مشہور ہیں، لیکن خریداروں کو کیا معلوم کہ جن کرم کلوں کو وہ مزے لے لے کر کھاتے ہیں انھیں انہی کے آبا و اجداد کے گوشت پوست کے رس نے رس بخشا ہے!

پیدرو انتونیو دے الارکون

پیش گوئی

اگرچہ مجھے یاد نہیں رہا کہ وہ کون سا دن تھا مگر تھا وہ ۱۸۱۶ء کے اگست کا ہی کوئی دن جب غرناطہ کے کپتان جرنیل کے دروازے پر ہردیا نامی سترسالہ جپسی آیا۔ اس کا پیشہ بھیڑیں مونڈنا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے کالے مریل گدھے پر سوار تھا جس کا ساز لے دے کر اک رسی تھی جو اس کی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ گدھے سے اترتے ہی کہنے لگا۔

"مجھے کپتان جرنیل سے ملنا ہے۔"

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ اس کی اس جسارت سے پہرہ دار کے دل میں مزاحمت کا جذبہ بیدار ہوگیا۔ اردلی مذاق پر اتر آئے اور اٹھین شش و پنج میں پڑ گئے اور اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ بہرحال غرناطہ کی قدیم سلطنت کے جرنیل حضور والا شان ڈان یوجینی او۔ پورلو کے رئی رڈ کو اس کی آمد کی اطلاع دے دی گئی اور چونکہ جرنیل بلند مرتبت علیم الطبع واقع ہوئے تھے اور پہلے ہی سے ہردیا سے واقف تھے جو اپنے کرتبوں، سودا بازیوں اور اپنے ہمسایوں کے مال و متاع کو حریصانہ نظروں سے دیکھنے کے لیے مشہور تھا، اس لیے انھوں نے اسے حضور میں آنے کے احکام صادر کر دیئے۔

وہ دفتر میں داخل ہوتے ہی دوزانو ہو کر بولا "مقدس ترین مریم پر رحمت ہو اور اس دنیائے صغیر کے بادشاہ والا شان کی عمر دراز!"

نواب نے جھوٹ موٹ تنک کر کہا "اس جھک جھک کو چھوڑو اور سیدھے ہو کر جو کہنا ہے کہو!"

ہردیا کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے "تو حضور والا لائیے مجھے ایک ہزار دونیاں عنائت کر دیجئے!"

"کون سی دونیوں کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی دونیاں، حضور جن کا کچھ دن ہوئے اعلان کیا گیا تھا کہ اس شخص کو بطور انعام دی جائیں گی جو پاروں کی بابت کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچائے گا۔"

"ہاں ہاں، تو کیا تم کچھ خبر لائے ہو اس کی؟"

"نہیں تو حضور۔"

"تو پھر؟"

"لیکن اب میں اسے جان پہچان گیا ہوں!"

"وہ کس طرح؟"

"بڑی سیدھی بات ہے حضور! میں نے اس کا پیچھا کیا، اس سے ملاقات کی اور اب اطلاع کے لیے حاضر خدمت ہو کر انعام کا خواستگار ہوں!"

جرنیل کی دلچسپی شک و شبہ سے دست و گریباں تھی، کہنے لگا "لیکن تمھیں یقین بھی ہے کہ تم نے اس سے ملاقات کی تھی؟"

جیسی کھلکھلا کر ہنس پڑا "صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضور والا دل میں کہہ رہے ہیں "لو اک اور جیسی آ گیا ہے مجھے دھوکا دینے کو!" خدا مجھے غارت کرے اگر جھوٹ عرض کروں۔ میں نے کل ہی پاروں سے ملاقات کی ہے۔"

"جو کچھ کہہ رہے ہو اس کی اہمیت بھی معلوم ہے تمھیں؟ کیا تمھیں خبر ہے کہ ہم کئی سالوں سے اس بدطینت خونی ڈاکو کے پکڑنے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جسے نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ کوئی پہچانتا ہے۔ کیا تمھیں خبر ہے کہ کوہستان کے مختلف علاقوں میں وہ ہر روز کئی راہ گیروں کو لوٹتا ہے اور پھر انھیں گولی کا نشانہ بنا ڈالتا ہے کہ اس کا قول ہے: موت کی زبان گنگ ہے۔

انہی طریقوں سے وہ اب تک کیفر کردار کو نہیں پہنچ سکا اور سب سے بڑی بات، کیا تمھیں خبر ہے کہ پارؤں سے ملنا موت سے ملنا ہے۔"

جیسی پھر ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ "کیا حضور کو خبر ہے کہ جو کام جیسی سے نہ ہوا وہ اس دنیا جہان میں کسی سے بھی نہ ہوگا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہم سچے طور پر کب روتے ہیں اور کب ہنستے ہیں؟ کیا حضور کے علم میں کوئی ایسی لومڑی ہے جو ہم سی مکار ہو۔ سو حضرت عالی میں پھر عرض کیے دیتا ہوں کہ یہی نہیں کہ میں اسے ملا ہوں بلکہ اس سے گفتگو بھی کی ہے!"

"کس جگہ؟"

"طوزار کو جانے والی سڑک پر۔"

"کوئی ثبوت؟"

"میں عرض کرتا ہوں، حضور عالی! اس بات کو کل سویرے ایک ہفتہ گزرے گا کہ میں اور میرا گدھا چند لٹیروں کے ہاتھوں میں پھنس گئے۔ انھوں نے مجھے کس کر باندھ دیا اور حیران پریشان کر دینے والی غاروں اور کھوؤں سے گزرتے گزارتے اک میدان میں لے آئے جہاں انھوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مجھے اک خوفناک شبہ ہوا۔ یہ کہیں پارؤں کے آدمی تو نہیں ہیں۔ اگر واقعی اسی کے آدمی ہیں تو پھر زندہ بچ نکلنے کی کوئی امید نہیں کہ اس ملعون کا قول ہے: جن آنکھوں نے میرا منہ دیکھا وہ کسی اور کا چہرہ دیکھ چکیں۔

"میں اپنی سوچ میں غرق تھا کہ ایک آدمی میری طرف بڑھا۔ اس نے عجیب و غریب مگر شان دار کپڑے پہن رکھے تھے۔ میرے کندھے کو تھپک کر کہنے لگا۔ "دوست! میں پارس ہوں۔"

"اس بات کو سننا اور دھم سے زمین پر آ رہنا ایک ہی چیز تھی۔ لٹیرے نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔

"میں کانپتے کانپتے اٹھا اور دو زانو ہو کر جس رنگ کی بھی آواز حلق سے نکل سکتی تھی، نکال کر کہنے لگا۔

"حضور کی روح پر رحمت ہو اے لوگوں کے بادشاہ! کون ہے جو حضور کو اس شاہانہ درجاہت سے پہچان نہیں سکتا جو خدا نے آپ کو بخش رکھی ہے۔ خدا کرے مائیں حضور جیسے اور سپوت جنیں! اجازت دیجیے میرے بیٹے! کہ میں آپ کو چوم لوں۔ خدا اس غریب بھیسی کا بیڑا غرق کر دے اگر اس کی آرزو نہ رہی ہو کہ آپ کے درشن کرے۔ آپ کو قسمت کا حال بتائے اور آپ کے شاہانہ ہاتھوں کو بوسہ دے! آپ مجھے ہمیشہ اپنی خدمت میں کمربستہ پائیں گے۔ کیا آپ معلوم کرنا پسند کریں گے کہ مردہ گدھوں کو کس طرح جیتے جاگتے گدھوں کے بدلے فروخت کر دیا جاتا ہے اور کس طرح بوڑھے گھوڑوں کو جوان گھوڑوں کی قیمت پر بیچا جاتا ہے اور خچروں کو کس طرح فرانسیسی پڑھائی جاتی ہے؟"

نواب مان ٹی جو ہنسے بغیر رہ نہ سکا۔ پوچھنے لگا "تو پاروں نے ان ساری باتوں کا کیا جواب دیا۔ کیا کیا اس نے بھلا؟"

"جو حضور کر رہے ہیں، وہی اس نے بھی کیا۔ خوب دل کھول کر ہنسا۔"

"اور تم نے کیا کیا؟"

"اور حضور میں اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ نارنجی جتنے بڑے بڑے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر اس نے تھوڑی دیر بعد میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔"

"جتنے آدمی اب تک میری طاقت کے آگے سرنگوں ہوئے ہیں دوست! صرف ایک تم ہو جو ان سب سے ہشیار نکلے ہو۔ ابھی اپنے بھونڈے مذاق کو چیخ و پکار اور واویلا اور اسی طرح کے خرافات کی صورت میں ظاہر کرتے رہے اور اس سے میں اور بھی چڑ جاتا رہا! صرف ایک تمھی ہو جس نے مجھے ہنسنے کا موقع دیا اور اگر یہ آنسو نہ بہتے تو۔۔۔"

"تو گویا یہ خوشی کے آنسو تھے میرے اچھے حضور؟"

"یقیناً! اور ابلیس ہی جانتا ہے کہ چھ سات سالوں میں آج پہلی بار ہنسنا نصیب ہوا ہے

مجھے لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ میں رویا بھی تو نہیں - اچھا تو اب کام شروع کریں اور سے لڑکو!"
پاروں کا اتنا کہنا تھا کہ میں آنکھ جھپکنے سے پیشتر بندوقوں کی باڑ میں گھر گیا۔ میں لاحاج وزاری سے کہنے لگا "حضور! رحم کیجیے مجھ پر رحم!"
پاروں نے چلا کر کہا - "رک جاؤ ذرا - ابھی نہیں! میں نے تمھیں اس لیے بلایا ہے کہ معلوم کروں کہ اس سے کیا کیا وصول کیا ہے تم نے؟"
"محض کھال میں منڈھا ہوا اک گدھا حضور!"
"کوئی روپیہ، پیسہ؟"
"تین ڈورو اور ستر دونیاں عالی جاہ!"
"تخلیہ!" — اور وہ سب چلے گئے -
لٹیرے نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہا - "اچھا تو مجھے قسمت کا حال بتاؤ" ہاتھ پکڑ کر میں لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا - یہ بدیہی امر تھا کہ مجھے بات کھل کر کہنے کا موقع مل گیا ہے - اس لیے میں نے پورے دل وثوق سے کہا -
"پاروں آپ مجھے زندہ چھوڑ دیں یا مار ڈالیں مگر یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتا کہ زود یا بدیر آپ کی موت پھانسی کے تختے پر واقع ہو گی"
اس نے کمال سکون سے جواب دیا "یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ اچھا بتاؤ کب؟"
میں نے دل میں سوچنا شروع کر دیا - "آج یہ مجھے آزاد کر دے گا - کل میں عزناطہ پہنچ کر اطلاع دے دوں گا - تیسرے روز اسے گرفتار کر لیں گے اور مقدمہ شروع ہو جائے گا" پھر میں نے بلند آواز میں کہا "آپ پوچھتے ہیں کہ کب؟ تو گرہ میں باندھ لیجیے حضور کہ اگلے ہی مہینے میں!" ادھر پاروں لرز گیا اور ادھر میں خوف کے مارے لرز اٹھا کہ قسمت کے حال بتانے کا شوق میری جان لے کے رہے گا - پاروں نے غور و فکر کے ساتھ بولتے ہوئے جواب دیا -
"سنو جپسی! تم میری قوت گرفت

یں رہوگے ۔اگر انھوں نے اگلے جینے کے آخر تک مجھے پھانسی نہ دی، تو میں تمھیں پھانسی دے ڈالوں گا ۔جس قدر یہ امر یقینی ہے کہ انھوں نے میرے باپ کو پھانسی دے دی تھی، اس بات کو بھی اتنا ہی یقینی سمجھو !! اگر اس وقت تک میرا خاتمہ ہوگیا تو تم آزاد ہو جاؤ گے !"

میں نے جی میں کہا، "بڑی عنایت ہے اس کی کہ مجھے موت کے بعد معاف کر رہا ہے ۔ مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اس مدت کو اتنا قلیل کیوں رکھا بہرحال ہم کچھ عرصۂ کورہ بالا کیمپ میں ٹھہرے رہے ۔ بعدہٗ مجھے ایک کھوہ میں مقفل کر دیا گیا اور پاروں گھوڑے پر سوار ہو کر گھنی جھاڑیوں میں سے اپنی راہ پر ہو لیا ۔

نواب کہنے لگا ۔" اچھا، میں سمجھ گیا ۔ پاروں مر گیا ہے اور تم آزاد ہو اور اس لیے تم اس کے ٹھور ٹھکانے سے واقف ہو ۔"

" معاملہ تو اس کے برعکس ہے حضور عالی ! پاروں زندہ ہے اور یہیں سے میری کہانی کے نہایت تاریک پہلو کا آغاز ہوتا ہے ۔ ایک ہفتہ گزر گیا مگر کپتان نے ادھر کا رُخ نہ کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے وہ آس پاس کہیں بھی دیکھنے میں نہ آیا تھا ۔ خصوصاً اس شام سے قطعاً غائب تھا جب میں نے اسے قسمت کا حال بتایا تھا، لیکن میرے محافظوں کا کہنا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے ۔ تم جانو، وہ اکثر اوقات جانے کہاں جہنم رسید ہو جاتا ہے اور جب وہ موقع محل مناسب سمجھتا ہے تو آ موجود ہوتا ہے ! سچ بات تو یہ ہے کہ وہ جو اتنی اتنی دیر غائب رہتا ہے تو ہمیں اس کے متعلق خاک بھی پتا نہیں ہوتا ۔ کچھ منت سماجت سے اور کچھ سارے کے سارے گروہ کی قسمت کا حال بتانے سے اور کچھ یہ پیش گوئی کرنے سے کہ سبھی پھانسی کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے اور سبھوں کا بڑھاپا سکھ چین سے گزرے گا ۔ میں انھیں کم از کم اتنا رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ مجھے شام کو کھوہ سے باہر نکال لیا کریں اور درخت سے باندھ دیا کریں کہ میں کھوہ کی سیل اور گرمی سے مرا جاتا تھا ۔ یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ وہ محافظ ہر وقت میرے پہلو میں موجود رہتے تھے ۔

ایک دن شام کے چھ بج رہے ہوں گے کہ وہ ڈاکو جو پاروں کے لفٹنٹ کے حکم کے ماتحت 'ڈیوٹی' پر تھے، کیمپ میں آئے اور ساتھ میں کوئی چالیس پچاس سال کے لگ بھگ کی عمر کا خستہ حال، فصل کاٹنے والا مرد بھی لیتے آئے۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ رہ رہ کر یوں رونا چلاتا تھا کہ کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ کہتا جاتا تھا۔ "خدا کے لیے میرے بیس ڈورو مجھے واپس کر دو! کاش تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں نے کس محنت سے انھیں حاصل کیا ہے! گرمیوں کے سارے موسم میں کڑکتی دھوپ کو خاطر میں نہ لایا اور برابر فصل کاٹتا رہا، جب کہیں ان کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ گرمیوں کے سارے موسم میں اک روز کے لیے بھی بیوی بچوں کی شکل نہ دیکھی اور برابر کام میں جُٹا رہا۔ سخت محنت کے ساتھ فاقہ کشی کر کر کے پائی پائی جوڑی اور پائی پائی جوڑ کر بیس ڈورو پلے باندھے! اور یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ سردیوں میں موت ہم سے دور رہے اور میں ان کو جا سینے لگاؤں اور ان کے وہ قرضے صاف کر دوں جو انھوں نے موت سے بچنے کے لیے ادھر ادھر سے مانگ رکھے تھے! اب خدا کے لیے کوئی اللہ کا بندہ کہہ دے کہ کہاں تک جائز ہوگا اگر میں یہ بیس ڈورو کھو دوں۔ یہ بیس ڈورو جو مرے لیے قارون کے خزانے کے برابر ہیں! مجھ پر رحم کھاؤ صاحبو اور سب سے پاک مریم کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے میرے بیس ڈورو واپس دے دو!"

لیڑے اس کی آہ و زاری کے جواب میں ہنس ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہے تھے! میں درخت سے بندھا ہوا دہشت سے کانپ کانپ جاتا تھا کہ آخر جپسیوں کے بھی بال بچے ہوتے ہیں۔

ایک لیڑا اس کی طرف بڑھا اور کہنے لگا "ابے احمق نہ بنو! تمھیں تو اس وقت زر و دولت سے کہیں زیادہ اہم چیز کی بابت سوچنا چاہیے تھا!"

"وہ چیز؟ کونسی ہے وہ چیز؟" فصل کاٹنے والے کے نزدیک سب سے بڑی بدقسمتی یہی تھی کہ بال بچے بھوکوں مریں۔

"تم اس وقت پاروں کے ہاتھوں میں پھنسے ہوتے ہو؟"

"پاروں۔ کون پاروں؟ میں تو اسے نہیں جانتا اور نہ ہی کبھی اس کی بابت سنا کچھ! میں آلی نکائتے کا رہنے والا ہوں اور سے وتے میں محنت مزدوری کرتا ہوں!"

"لیکن دوست! پاروں کا مطلب ہے موت! جو بھی ہمارے جال میں پھنس جائے، مرے بغیر چھٹکارا نہیں پا سکتا! اس لیے پہلے دو منٹوں میں وصیت کی سوچ لو اور دوسرے دو منٹوں میں خدا کے یہاں پہنچنے کا دھیان کر لو! ہو جاؤ تیار! ابھی چار منٹ باقی ہیں اور پھر موت!"

"میں ان کا پورا پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو اور میری سن لو!"

"بولو!"

"میرے چھ بچے ہیں اور ایک قسمت کی ماری بیوہ۔ بیوہ ہی کہوں گا کہ ابھی مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا، تمھاری آنکھوں میں صاف لکھا نظر آ رہا ہے کہ وحشی درندوں سے بھی بدتر ہو۔ ہاں ہاں بدتر ہو کہ ایک ہی نسل کے درندے کو موت کے گھاٹ نہیں اتارتے! لیکن خدا کے لیے مجھے معاف کر دو کہ مجھے ہوش نہیں کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ صاحبو! آخر تم میں کوئی نہ کوئی تو باپ ہوگا۔ کیا تم میں کوئی ایسا نہیں جو باپ ہو؟ کیا تم کو معلوم ہے کہ سارے سردیاں بھوکوں مرنا کیا ہوا کرتا ہے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ کیا حال ہوتا ہے اس ماں کا جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھتی ہے۔ وہ جگر کے ٹکڑے جو چلّا چلّا کر کہہ رہے ہوں۔ "ماں ہم بھوک سے مرے جا رہے ہیں۔ ماں ہم سردی سے مرے جا رہے ہیں۔" صاحبو! میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ ان کے بغیر زندگی ہو گی بھی کیا۔ محنتوں اور فاقوں کی زنجیر! اگر مجھے جینا ہے تو محض اپنے بچوں کی خاطر جینا ہے! ہائے میرے بچے۔ ہائے مرے جگر کے ٹکڑے!"

وہ زمین پر لوٹ لوٹ گیا۔ اور لوٹتے لوٹتے چہرہ جو چوروں کی طرف کیا تو ہائے وہ چہرہ! وہ چہرہ اس ولی کا چہرہ تھا جسے پادریوں کے قول کے مطابق نیرو نے شیروں کے آگے ڈال دیا

تھا! کوئی شے ان کے سینوں میں ابھر رہی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ سب متفق ہیں۔ ایک نے جرأت سے کام لے کر کہہ دیا۔"

نواب کہانی سے بے حد متاثر ہو رہا تھا۔ بے ساختہ کہہ اُٹھا۔" کیا کہہ دیا اس نے۔"

اس نے کہا۔" بھائیو! جو کچھ ہم نے کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس کی بھنک تک پاروں کے کانوں میں نہ پہنچنے پائے!"

سب بولے۔" ہرگز نہ پہنچے گی!"

ایک نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" بھلے میاں! اب تم اپنے گھر کی راہ لو!"

ادھر میں نے بھی اسے اشاروں اشاروں میں سمجھا دیا کہ فوراً سے پیشتر دفع ہو جائے!

سبھوں نے کہا۔" تیز قدم!"— اور انھوں نے اس کی طرف پیٹھ کر لی!

فصل کاٹنے والا اپنے ہاتھ کو لجاجت کے ساتھ پھیلائے ہوئے تھا!

"ارے اب بھی تسلی نہیں ہوئی تمھاری!" ایک نے غرّا کر کہا۔" اپنی رقم بھی مانگتے ہو کیا؟ جاؤ بھئی جاؤ، ہمارے صبر کا امتحان نہ لو!"

وہ روتے ہوئے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ڈاکوؤں نے اس معاملے کو راز میں رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے سامنے قسمیں کھانی شروع کر دیں اور قسمیں کھانے کھلانے میں شاید آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سان نہ گماں، پاروں آ رہا ہے اور اس کی گھوڑی کے پہلو بہ پہلو فصل کاٹنے والا بھی موجود ہے!

چوروں کی سٹی گم ہو گئی اور گھبرا کر پیچھے کو ہٹے! پاروں بڑے اطمینان کے ساتھ گھوڑی سے اترا۔ دونالی بندوق کو کندھے سے اتارا اور ساتھیوں کا نشانہ باندھتے ہوئے بولا۔" احمقو! ہونقو! مجھے تعجب ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو میں گولی کا نشانہ کیوں نہیں بنا رہا! چلو جلدی کرو

اور اس آدمی سے جو بیس ڈورو لیے تھے اسے فوراً لوٹا دو" چوروں نے اس رقم کو فصل کاٹنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ فوراً پاروں کے قدموں پر گر گیا کہ اس کا دل کس قدر رحم سے بھرا ہوا تھا۔ پاروں نے اس سے کہا۔

"جاؤ میاں! خدا کی رحمت تمھارے ساتھ ہو! تمھارے سمجھانے کے بغیر میں بھلا کب ان تک پہنچ سکتا تھا۔ اب دیکھ لیا نا تم نے کہ تم نہ دلیل نہ وجہ مجھ پر اعتبار کرتے ہوئے ڈرتے تھے! میں نے اپنے وعدہ کو نبھا دیا اور تم نے اپنی رقم وصول کر لی قصہ ہوا پاک۔ اب یہاں سے چلتے بنو!"

فصل کاٹنے والا بار بار پاروں کے پاؤں چومتا تھا وہ خوشی خوشی اپنی راہ پر ہو لیا۔ ابھی بمشکل پچاس قدم ہی گیا ہوگا کہ اس کے مربی نے پیچھے سے آواز دی۔ غریب فوراً ہی الٹے پاؤں بھاگا آیا! "کیا حکم ہے آپ کا؟" اور اس کی خدمت بجالانے کے لیے بیتاب تھا جس نے اس کے خاندان کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

"تم پاروں کو جانتے ہو؟" اس نے خود ہی پوچھا۔

"نہیں تو۔"

وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔ پاروں نے اپنی دونالی بندوق اس کے کلوں پر رکھ کر داغ دی! وہ گر پڑا۔ خاک و خون میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا!

"تم پر لعنت ہو خدا کی!" صرف یہی تھے وہ الفاظ جو وہ کہہ سکا۔

مارے دہشت کے مجھے کچھ سجائی نہ دے رہا تھا! مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس درخت کے ساتھ بندھا ہوں وہ ہلکے سے ہلا ہے اور میرے بندھن ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ ایک گولی فصل کاٹنے والے کو زخمی کر کے سیدھی اس رسی کے آ لگی جس سے میں بندھا ہوا تھا اور اس کو کاٹ کے رکھ دیا۔ میں نے اس آزادی کو چھپائے رکھا اور بھاگ نکلنے کے موقع کے انتظار میں رہا۔ اس اثنا میں پاروں فصل کاٹنے والے کی طرف اشارہ کر کے اپنے آدمیوں سے مخاطب ہوا۔

"اب تم اسے لوٹ سکتے ہو! حماقت کے پشتارو، بیوقوفی کے بلندو! وہ شاہراہ پر چیختا چلاتا چلا

جا رہا تھا اور تم نے آزاد بھی اسی لیے کیا تھا اُسے ؟ ہیں ؟ وہ تو کچھ مقدر بھلے تھے جو مجھی سے مٹ بھیڑ ہو گئی اور یُوں طرح وقوع کی تفصیل سے مجھے آگاہ کر کے یہاں لے آیا تھا اگر فوجیوں کو بھی لے آتا تو ہم سب جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے اب تک ! بوٹ کے بعد قتل نہ کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا تم نے ؟ خیر، بہتیرا وعظ ہو چکا۔ اب اسے دفن کرو دکہ سڑنے نہ پائے !"

ڈاکو تو قبر کھود رہے تھے اور پارس میری طرف پیٹھ کیے کچھ کھا رہا تھا۔ میں نے ہولے ہولے درخت سے ہٹنا شروع کیا اور کھسکتے کھسکتے ایک قریبی کھوہ میں گھس گیا۔ رات ہو چکی تھی اور میں تاریکی کے پردے میں انتہائی تیزی سے چل پڑا۔ مجھے تاروں کی روشنی میں اپنا گدھا نظر آ گیا جو چپ چاپ گھاس پر منہ مار رہا تھا اور آتش کے درخت سے بندھا ہوا تھا۔ میں اس پر سوار ہو گیا اور راہ میں کہیں نہ ٹھہرا اور بھاگم بھاگ یہاں آ پہنچا اب حضور عالی مجھے ایک ہزار دونیاں عنایت فرمادیں اور میں آپ کو پاروں کی کھوج میں روانہ کر دوں۔ جس نے یونہی یاد آ گیا، میرے ساڑھے تین ڈورو بھی دبا رکھے ہیں !"

جیسی نے پاروں کا پورا پورا حلیہ بتلانے کے بعد موعودہ انعام حاصل کر لیا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔ اس کے جانے پر نواب اور اک اور شخص جس نے مجھے اس کہانی کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے، قطعاً حیران و ششدر بیٹھے رہ گئے !

اب یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ پاروں کے متعلق ہردیا کی پیش گوئی کا اندازہ ممکن حد تک صحیح نکلا تھا۔

جو واقعہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے، اس کے پندرہ روز بعد صبح کے قریباً نو بجے بے فکروں کا جم غفیر غرناطہ کے سان جوآن اور سان فی لائپ کے بازاروں میں دو فوجی دستوں کے اجتماع کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ نواب نے پاروں کی ذات، اس کی جائے پناہ اور ساتھیوں کا حلیہ مشتہر کر دیا تھا اور ان فوجیوں کو گھنٹہ کے بعد اس کی تلاش میں ادھر اِدھر نکلنے کا حکم موصول ہو چکا تھا۔ اہالیانِ غرناطہ اک غیر معمولی دلچسپی اور جوش و خروش کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن

غرناطہ کی قدیم سلطنت میں پاروں نے کچھ اس قسم کا خوف اور دبدبہ طاری کر رکھا تھا کہ فوجی اس اہم معرکے پر روانہ ہونے سے پیشتر نہایت متانت اور خموشی کے ساتھ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے۔

ایک فوجی نے اپنے ساتھی سے کہا "معلوم ہوتا ہے ابھی قطار میں کھڑے ہونے والے ہیں ہم! مگر دفعدار لوپے ز دکھائی نہیں دے رہا کہیں!"

"بڑی عجیب سی بات ہے۔ جب بھی پاروں کو ڈھونڈھ نکالنے کا تذکرہ ہوتا تھا تو یہ شخص ہمیشہ پیش پیش تھا۔ اسے پاروں سے شدید نفرت تھی۔"

ایک تیسرا گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولا۔ "تمھیں نہیں معلوم کیا ہوا ہے؟"

"ہیلو! یہ ہمارے نو آمد بھائی ہوں گے، کہو بھئی پسند آیا ہمارا دستہ؟"

"جی ہاں! واقعی بہت پسند آیا ہے تم لوگوں کا دستہ" — مخاطب نے جواب دیا جو پیلے چہرے اور خوبصورت جسم کا جوان تھا اور جسم کو وردی نے قدرے چھپا رکھا تھا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟" پہلے نے پوچھا۔

پیلے چہرے والے نے جواب دیا۔ "تو ہاں بیچارہ دفعدار لوپے ز تو مر گیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو ارے مینوال! توبہ کرو بھائی۔ مجھے تو یقین نہیں اس بات کا۔ میں نے تو اسے صبح دیکھا ہے۔ بالکل جس طرح تمھیں اب دیکھ رہا ہوں!"

جس فوجی کو مینوال کے نام سے پکارتے تھے اس نے نہایت سکون سے کہا "آدھ گھنٹہ ہوا کہ پاروں نے اسے مار ڈالا ہے!"

"پاروں۔ وہ کہاں ہے؟"

"وہ یہیں ہے۔ عین غرناطہ میں۔ کوہ سگ پر لوپے ز کی لاش ملی ہے!"

سب خموش تھے مگر مینوال تھا کہ محبِ وطن کی شان کے ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔

ایک سارجنٹ بولا۔ "چھ دنوں میں گیارہ فوجی فنا ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاروں

ہمیں نیست و نابود کرنے کی ٹھانے ہوئے ہے لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ وہ غرناطہ میں موجود ہے۔ اور ہم ہیں کہ اسے نوجا کی پہاڑیوں میں تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

مینوال نے سیٹی بند کر دی اور حسب معمول لاپروائی کے انداز سے کہنے لگا۔ "اک بڑی بی نے اعلان دیکھا تو کہنے لگی، جب لوپے ز کو اس نے مار ڈالا ہے تو یہ جو اس سے ملنے جائیں گے تو امید ہے مل کے بڑے خوش ہوں گے!"

"ارے بھائی، اس کا ذکر اتنی تحقیر سے کرنے میں تم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جرأت سے کام لے رہے ہو!"

مینوال نے کندھے اچکا کر کہا۔ "یار وں آدمی ہی تو ہنسے اور تو کچھ نہیں نا؟"

عین اس وقت قطار بندی کا حکم ہوا اور فوجی دستوں کی حاضری شروع ہو گئی۔

اتفاق کہئے کہ ادھر سے ہرڈیا بھی گزر رہا تھا اور دوسرے راہگیروں کی طرح وہ بھی فوجیوں کو بنظر تحسین دیکھنے کے لیے دم بھر کو ٹھہر گیا۔

نو آمد فوجی، مینوال کی نظر جو اس پر پڑی تو چونک اٹھا اور چند قدم پیچھے ہٹا کہ اپنے ساتھیوں کے پیچھے چھپ جائے اور جب ہرڈیا نے اسے دیکھا تو اک چیخ ماری اور یوں اچھل پڑا گویا کسی زہریلے ناگ پر پاؤں آ پڑا ہو اور چھوٹتے ہی 'سان جے ری نی مو' بازار کی طرف بھاگنے لگ پڑا۔

اتنے میں مینوال نے اپنی بندوق اٹھائی اور جیسی کا نشانہ باندھا مگر اک اور فوجی نے بڑی پھرتی سے اس کی بندوق کو یوں دھکا دیا کہ نشانہ ہوا میں خطا ہو گیا۔

تماشائیوں کی طرف سے پیہم آوازیں آ رہی تھیں "ارے پگلا ہے پگلا — دیوانہ ہو گیا ہے۔ ہوش حواس غائب ہو گئے ہیں اس کے!" اور افسر، سارجنٹ اور شہری اس پر پل پڑے۔ اس نے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوشش تو کی مگر سب نے اسے زیر کر لیا اور سوالوں، لعنتوں اور بے عزتیوں کی بوچھاڑ کر دی! وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا!

اس دوران میں لوگوں نے جو بندوق چلنے کی آواز سنی اور ساتھ ہی ہردیا کو بھاگتے دیکھا اور وہ سمجھے کہ کوئی بدمعاش مجرم ہے اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

جیسی بولا۔ "مجھے جرنیل کے پاس لے چلو، مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔"

لوگ بولے "کیا بات ہے تمھاری! کہنا بھی ہے تو جرنیل سے! پہلے یہ تو کہو قتل کسے کیا ہے تم نے؟ تو وہ رہے سپاہی! وہی تمھارا بندوبست کریں گے!"

ہردیا نے کہا "بندوبست تو ہو ہی رہے گا مگر دیکھنا کہیں پاروں مجھے مار نہ ڈالے!"

"ارے پاروں کہاں؟ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں!"

"جو ساتھ چلے آؤ گے تو سب پتہ چل جائے گا۔" اور لوگ اسے فوجی سردار کے پاس لے آئے۔ جیسی نے مینوال کی طرف اشارہ کر کے کہا "حضور! یہی پاروں ہے اور میں ہوں وہ جیسی جس نے دو ہفتے قبل جرنیل کی خدمت میں اس کا حلیہ عرض کیا تھا۔"

لوگ چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے "پاروں پکڑا گیا۔ پاروں پکڑا گیا! پاروں فوجی کے بھیس میں پکڑا گیا۔"

فوجی سردار نے جرنیل کے موصولہ احکام کو پڑھتے ہوئے کہا "اب شک شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نہایت احمق ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن بھلا کون مائی کا لال ایسا تھا جسے یہ سوجھتی کہ خود چوروں کا سردار ہی اُن فوجیوں میں شامل ہو گیا ہے جو اسی کو تلاش کرنے جا رہے ہیں۔"

پاروں جیسی کو زخمی شیر کی طرح تک رہا تھا اور دل میں کہتا تھا "بڑا ہی ہونق نکلا میں! اک یہی تھا جسے جیتے جی چھوڑ دیا! جو کچھ ہوا ہے میں ہوں ہی اسی لائق!"

ایک ہفتے کے بعد پاروں کو پھانسی دے دی گئی اور یوں جیسی کی پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی!

آرتورو آلابارسے

بھیڑیا ۱۳

سورج افق کے نیچے ڈھلکتے ہوئے، کنارِ صحرا کے ساتھ ساتھ بنفشئی روشنی کی لکیر کھینچ رہا تھا۔ آندھیوں کے جھکڑوں سے میدان میں مٹی کے بگولے اڑ رہے تھے۔ زہرہ اپنے تاریک گوشۂ فلک میں بیٹھی چمک دمک رہی تھی اور جوآن دی ہردرچرواہے نے تھکے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اپنے چھتارے کی کھنچی ہوئی تاروں پر ایک حزن آمیز سُر چھیڑ دیا۔ گھوڑا تھکاوٹ سے بدقت قدم اٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا سارا جسم کاٹھی کے اگلے حصے پر جھکا تھا۔ ٹوپی گردن کی پچھلی طرف پڑی تھی۔ آنکھیں گھوڑے کی گرد آلود ایال پر جمی تھیں اور وہ دردناک میدانی گیت گا رہا تھا۔ اکثر اوقات گانے کے وقفوں کے دوران وہ تنہا خود کلامی میں مصروف ہو جاتا۔ پورے تیرہ گھنٹے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے آسیب نما ریوڑ کے نشانوں پر چلتے جانا۔ پورے تیرہ گھنٹے بیابان میں سورج کے ساتھ ساتھ سوار رہنا۔ پورے تیرہ گھنٹے پسینے میں شرابور، خاک سے مٹی مٹی اور چمڑے سے پیوست ہونا۔ پورے تیرہ گھنٹے۔ اس بیکراں ویرانے میں مارے مارے پھرتے رہنے سے اس انسان کا زندگی سے تعلق کھو گیا تھا۔ اس کی روح سوکھی چھالیا کی طرح خشک ہو رہی تھی اور اس کی جلد ہی نہیں، دل بھی پتھر بن رہا تھا۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی زمین و آسمان کے سوا اور کوئی شئے موجود نہ تھی اور یہ دونوں افق پر غروبِ آفتاب کی خونین رنگ لکیر کے ساتھ مل جاتے تھے۔ اس وقت صحرا کے پتھر اس گرمی کو فضا میں لوٹا دیتے تھے جو وہ دن بھر جذب کرتے رہتے تھے۔ خاکستری رنگ ناگ پھنی

کے سائے لامحدود حد تک طویل ہو جاتے تھے اور 'ہرد رجوآن' ان ٹھٹھرتے فاصلوں میں گھوڑے پر سوار، ہولے ہولے داخل ہوتے ہوتے اپنے گیت سے یوں متصل تھا جیسے کوئی محبوب سے متصل ہو۔ آندھیوں کے شور نے موت اور رات کی آمد آمد کا اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ تو ہم اور خوف چپکے چپکے اس کی رگ و پے میں سرائت کر گئے تھے لیکن 'ہرد رجوآن' کا دل مصروف تھا۔ وہ اک مقصد کے ماتحت آہستہ آہستہ اک خاص مقام کی طرف رخ کیے ہوئے جا رہا تھا۔ ہوا میں اک بو آ رہی تھی جس کی رہنمائی میں اس نے ناک چڑھا کر ہوا کو سونگھا تو اس میں مردار گوشت کی بو تھی۔

آسمان پر تاریکی چھا گئی، بہت دور کہکشاں چمک رہی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا فضائے بسیط میں کہکشاں نہیں شبنم چمک رہی ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ تاروں کے جنگلے کے سامنے کھڑا تھا، جو غیر مرئی حد تک پھیلا ہوا تھا — صحرا میں ایک گرد آلود لوہے کی سرحد۔ وہ گھوڑے کو اس تک لے جاتے ہوئے چند گز ادھر ہی کھڑا ہو گیا، اس نے گیت ختم کر دیا اور جامد و ساکت بیٹھ گیا۔ وہ لوہے کی غبار دار تار کو تک رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام ڈھیلی تھی۔ اس نے سخت زمین پر ٹاپ مارنے شروع کر دیے اور گھڑ سوار سڑن سے بھری ہوئی دم گھٹنے والی ہوا میں مصروف تھا۔ بھیڑیوں کی گنتی کر کے مسکرا دیا۔ بارہ تھے۔ بارہ بھیڑیے جنگلے سے لٹک رہے تھے۔ نیچے ایک دوسرے پر پڑے ہوئے دُمیں سخت، سرسینوں میں دھنسے، اس حال میں جانور دھوپ میں سڑ رہے تھے۔

سرخی مائل بادامی رنگ کی سکڑی ہوئی تھوتھنیوں پر خشک خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہوا میں کھیتوں کے ڈراؤنے کوّے یا جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ جب بیابان میں آندھی چلتی تھی تو ان کے سوکھے ہوئے بالوں سے کھیلتی تھی۔ بال کانپتے، ہلتے اور مردہ جسموں میں زندگی کے یہ آثار ظالمانہ ستم ظریفی کے مترادف تھے۔ 'ہرد رجوآن' کے ہاتھ بڑے بڑے اور کھردرے تھے۔ گندے ناخن اور ٹھنٹھوں جیسی انگلیاں لیے ہوئے۔

یہ اسی کے ہاتھ تھے جنھوں نے تیزاب کھنگالا تھا اور کھالوں اور کچے چمڑے کی تندوں کے سخت ریشے کھینچ ڈالے تھے یہی تھے۔ وہ جو بچھڑوں کی ریشمیں کھالوں پر جلتے نشان لگاتے تھے اور جن سے نشانوں کے بعد جلنے گوشت کی بو آتی تھی اور یہ اسی کے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھ تھے جو سال بسال لاتعداد جانوروں کے لیے اذیت کا سامان بنتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس کی ذات میں حیوانوں کا اندھا تشدد۔ خاموش ضدیت اور مقصد کی پرکھاروگی وحیدیت آجمع ہوئی تھی۔ بیابان کی بے پناہ وسعتوں میں کھوئے رہنے اور تنہا مارے مارے پھرنے سے اس کی کائنات تنی سمٹ گئی تھی کہ اس کی ٹوپی کے اندر سما سکتی تھی: تمباکو۔ شراب۔ خیالات اس کے علاوہ جو بھی شئے تھی۔ آسمان۔ بیابان تنہائی۔ وہ محض اک دہشتناک اور خوف انگیز استفہام تھی اور بس!

اس روز وہ انھیں گننے کے لیے بڑی دور سے آیا تھا۔ یہ بھیڑیئے! یہ رات کے آسیب، چاند پر ہوا نکھ ہوا نکھ کر رات کی خاموشی کی بنیادیں ہلا ڈالتے تھے۔ یہ شکاری اپنی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سمیت ریوڑوں کی گھات میں لگے رہتے تھے۔ یہی ہر درجوان کے قدرتی دشمن تھے اور جب وہ جال اور بندوق سے ان کا شکار کرتا تھا تو جو پکڑے جاتے تھے انھیں بڑی بربریت کے ساتھ فنا کے گھاٹ اتارتا تھا کہ دوسروں کے لیے عبرت پیدا ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ انھیں تار کے چمکتے خاروں سے لٹکا دیتا تھا۔ تار کے ساتھ ساتھ ان کا خون سیاہ قطرے بناتا چلا جاتا تھا اور ان کے سائے شام کے ستارے کی بغشتی روشنی میں اور طویل ہو کر صحرا پر ہلاکت کی لکیریں کھینچ دیتے تھے۔ ہر درجوان اس سفاک تار پر تیرہ بھیڑیئے دیکھنے کی خاطر کبھی اپنے آپ سے باتیں شروع کر دیتا اور کبھی مسکراتا، گنگناتا اور کوستا۔ سب سے قد آور بوڑھا بھیڑیا ۱۳ بڑا شاطر، محتاط اور سرکش تھا اور اسے ہمیشہ جُل دے کر صاف نکل جاتا تھا۔ اک چٹان کے سنگ وخاک سے ایک اور چٹان بن گئی تھی۔ وہ مسلسل راتوں کو کبھی اس چٹان پر کبھی جھاڑیوں کے کنج میں چھپ کر اور کبھی سوکھی ہوئی دریا برآمد مٹی پر کھڑے ہو کر چاند پر اوہا نکا کرتا تھا اور ہر درجوان کی آنکھیں تاروں پر جمی ہوتیں اور اس کی آوازوں پر کان لگائے سردی کے مارے اپنے کمبل میں کانپ رہا ہوتا۔ اسے

اپنے خیالوں میں یوں نظر آتا کہ بھیڑیا ۱۳ کی پیٹھ کبڑی ہو گئی ہے، دُم سخت اور تھوتھنی نوکیلی! اسے یوں معلوم ہوتا کہ وہ اسے بیابان میں دوڑتا پھرتا دیکھ رہا ہے۔ خوانخوار اور تاباں۔ جب مہینوں بعد وہ اپنے 'سان انتونیو' کے تیل کے بیوپاری آقا کے سامنے حساب کتاب پیش کر رہا ہوگا تو اسے کہنا ہی پڑ جائے گا کہ ایک مُعمر بھیڑیا ایک سے زیادہ بچھڑے اٹھا لے گیا ہے۔

'ہرد رجوان' خدا یا ابلیس سے دعائیں مانگتا تھا کہ بھیڑیا ۱۳ اس کے ہاتھ لگ جائے۔ اس نے آخری گولی کو بندوق کی نالی کے اندر ڈالا اور اس کریہہ منظر سے منہ موڑ کر بھیڑیوں کو وہیں چھوڑ دیا جو ہوا میں جھول رہے تھے۔ اور جن کی سرخی مائل کھالیں شفق کی آخری روشنی کو مقید کر رہی تھیں، لیکن ان کا نقش اس کے ذہن پر کندہ تھا، قائم دائم تھا اور تنہا آدمی کی یادوں کی طرح امٹ۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بھیڑیا ۱۳ ٹھٹک رہا ہے پنجے ایک دوسرے پر پڑے ہیں اور سر ڈھلکا ہُوا ہے اور خود مغلوب ہو کر ختم ہو گیا ہے۔ اس خیال سے اسے اک گونہ راحت ہوتی تھی اور یہ خیال درد تھکن اور تنہائیوں کے نشان مٹا کر اس کے دل میں آباد ہو جاتا تھا۔ تمازتِ آفتاب نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ اور اس کی جلد لاتعداد آڑی ترچھی لکیروں کا جال بنی ہوئی تھی۔ وہ راہب اور کھیتی کے جانور کی مخلوط نسل تھا۔ اور اس کے چوڑے چکلے چہرے پر حیوانیت کے آثار آشکارا تھے۔ اس کی ڈاڑھی سرخی مائل تھی اور دھوپ نے بھوؤں کا رنگ اڑا رکھا تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں اس کی بھرویں میں سے روشنی کے کڑے بالوں کی مانند ابھرتی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پتلیاں سورج کی خیرہ کن روشنی کی وجہ سے سکڑ گئی تھیں۔ ان کا رنگ خاکستری مائل نیلا تھا۔ معصوم ہونے کے باوجود سخت اور خشک تھیں۔ اگر ان میں کوئی چیز جھلکتی تھی تو وہ تھا صحرا۔ بے پایاں تنہائی کی ہندسی اور مجرد، سپاٹ سطح۔ بآخر بیابان کی جوت جاتی رہی اور نتھری رات نے ڈیرے ڈال دیے۔ 'ہرد رجوان' گھوڑے سے اترا اور ناگ پھنی کے پیچھے چھپ گیا۔ آگ کی روشنی سے پرہیز کرنے کی خاطر اس نے تمباکو کا ایک ٹکڑا لے کر چبانا شروع کر دیا۔ اس کی انگلیاں بندوق کے گھوڑے سے کھیل رہی تھیں۔ وہ آنے والی مسرت کا مزا پہلے ہی سے

لے رہا تھا اور محوِ انتظار تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں چاند اپنے غیر متغیر مدار میں نمودار ہوگا اور بھیڑیا ۱۳ پچھلی ٹانگوں کے سہارے بیٹھ کر اپنی گٹھے والی گردن کو رات کے نغموں کے لیے اُوپر اُٹھا دے گا اور وہیں ایک فولاد میں ملفوف تیز رو گولی اس کی آواز کو گلے یا سر ہی میں ختم کر ڈالے گی۔ یہ تھی ہر درجوان کی سوچ۔ وہ کمبل میں پڑا مسکرا رہا تھا۔ چپ چاپ منتظر تھا۔ چاند اور بھی بلند ہو گیا مگر بھیڑیئے ۱۳ کا کہیں اتا پتا نہ تھا۔ اس کی بندوق کا فولاد انگلیوں میں سرد تھا۔ تعجب تو اس امر کا تھا کہ وہ ابھی تک باہر کیوں نہیں نکلا۔ صحرا کس قدر سنسان، مرگ آسا اور بے جان دکھائی دیتا تھا۔ پتھر تھے یا یہ آدمی فضائے بسیط تھی یا یہ آدمی۔ اس کی ایک ٹانگ سو گئی تھی۔ منجمد خون کی سوئیاں چبھ رہی تھیں۔ وہ مزاحم نہ ہُوا اور ساری کی ساری لات سُن ہو گئی۔ ایک خاموشی، عظیم خاموشی اس کی روح کو تاخت کر رہی تھی۔ یہ کوئی خول نہیں تھا جو اس کے ظاہر پر تخلیق ہو رہا تھا بلکہ اس کی اپنی ذات ہی کی حرارت تھی۔ اس کے باطن کی ہر غیر محسوس شے کا فرار تھا۔ ہر درجوان کو محسوس ہُوا کہ کوئی شے اسے چھوڑ رہی ہے۔ کوئی اہم شے اس سے جدا ہو رہی ہے۔ اس کے بھدے بوٹ خالی خالی ہیں۔ اس کی پتلون اور کمبل اندر سے کھوکھلے ہو گئے ہیں اور ایک غیر متحرک تودے کی بے لوچ صورت، جسم کے آثار باقیات کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ 'ہر درجوان' سورج کی تپش میں جلے بھنے پتھروں کی مانند جو رات کو فضا میں دن بھر کی جذب شدہ حرارت کو لوٹا دیتے ہیں، روح کے بغیر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچنے، یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے بے روح لمحی صورتوں کی جھلکیوں کے سوا اور کچھ یاد نہ آیا۔ تیل کے کنوؤں کے عجیب سے روئیں مینارے، بیئر کا نرش مزا تیل کے کنوئیں کھودنے والوں کے موٹے جسیم اور سفید دھڑ۔ مہیم ریوڑ جو پاس سے گزرتے ہوئے مٹی کے بادل اٹھا جاتے تھے، بچھڑے کی کھوپڑی جو پاس کے مارے دم توڑ گیا تھا۔ ان لڑکیوں کے ہوس انگیز بدن جن سے وہ وقتاً فوقتاً بیابان کی سرحدوں کے چکلوں میں آشنا رہا تھا۔ یہ سب اس کے ذہن کے بے رنگ پردے پر ابھر رہے تھے لیکن یہ ساری صورتیں اتنی کھوکھلی اور بے جسم تھیں کہ اس کے لیے ناکارہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ خاموشی مکمل اور قطعی ہو گئی اور 'ہر درجوان' سرد رات میں کانپتا رہا۔

روح اس سے مفارقت کر گئی اور وہ اس کے بغیر اک دھبا تھا جو تنہائی میں کھو گیا ہو۔ اپنی بندوق کو گھٹنوں کے ساتھ پیوست کرتے ہوئے، اس نے منہ میں بچے ہوئے ترش تمباکو کو پھر چبانا شروع کر دیا۔ وہ منتظر رہا۔ وہ مایوسانہ منتظر تھا کہ معاً ہوا نکنے کی مختصر آواز آئی۔ وہ اسے سنتے ہی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ سیدھا کھڑا تھا۔ لرزاں۔ ہاتھ میں بندوق لیے چاروں اور دیکھ رہا تھا۔ بھیڑیا ۱۳ آ پہنچا تھا۔ کہیں نزدیک ہی اس کی زرد آنکھیں چمک رہی ہوں گی۔ اس نے بندوق کی نالی سے حفاظتی نلی کو اتار ڈالا اور میدان میں بھاگنا شروع کر دیا۔ ہوا نکلنے کی آواز بار بار آئی اور پھر آئی۔ وہ بڑی احتیاط سے اس جگہ پہنچا جہاں سے آوازیں آئی تھیں۔ اسے محسوس ہُوا کہ زندگی لوٹ آئی ہے اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اس کے اپنے ہی ہیں اور اس کے بڑے بڑے پاؤں اپنے جانے پہچانے پُرانے بوٹوں کے اندر موجود ہیں۔ وہ ابھی راستے کی سُدھ لے رہا تھا۔ متامل تھا کہ اک دردانگیز آواز سنائی دی جس کے سہارے وہ جھاڑی کے زرد چھدرے ہُوئے سائے کے پاس پہنچ گیا۔ یہ رہا بھیڑیا ۱۳۔ قدآور اور خاکستری رنگ۔ اس کی غراتی ہوئی تھوتھنی سے مضبوط اور سفید دانت دکھائی دیتے تھے۔ اس نے پیٹھ کو کبا کر رکھا تھا۔ پنجوں سے خون جاری تھا اور سیاہ اور سوجی ہوئی زبان باہر لٹک رہی تھی۔ وہ بھاگ جانے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت اور خوف سے چمک رہی تھیں اور اپنی طرف ہولے ہولے آنے والے آدمی کو تک رہی تھیں۔ اس کی پیٹھ کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور وہ مختصر گلوگرفتہ آواز میں ہوا نکلتا تھا۔ ہُر در جوان نے حالات کا اندازہ لگایا۔ بندوق اٹھائی اور شست باندھ لی۔ جانور مارے پیاس کے مرا جا رہا تھا۔ درد سے اتنا کمزور پڑ گیا تھا کہ اب چاند پر ہوا نکلنے کی ہمت نہ رہی تھی اور آج کی رات اس کی آخری رات تھی۔ ہُر در جوان مسکرا دیا۔ اسے تمام مصلوب بھیڑیوں کا خیال آ گیا۔ وہ ان کے متعفن ماس کی بدبو تک سونگھ سکتا تھا۔ ہولے ہولے بندوق کے گھوڑے پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی گویا بندوق نہیں کمان کھینچ رہا تھا۔ یوں جانور اور آدمی ایک دوسرے کو کتنے ہی ثانیے تکتے رہے۔ مگر گولی کبھی بھی اپنے نشانے تک نہ پہنچی۔

ہُرورجوان نے معاً اپنا ارادہ بدل دیا اور گولی آسمان کی طرف ہوا میں چھوڑ دی۔ خلائے بسیط میں آواز گونج اٹھی۔

بھیڑیا ۱۳ ہانپ رہا تھا۔ اس کے دونوں پہلو دھونکنی کی طرح ابھرتے اور بیٹھتے تھے۔ وہ جھاڑیوں میں زندہ سلامت موجود تھا۔ آدمی نے اک نظر دیکھا۔ چند محبت بھرے الفاظ کہے اور پانی لانے کے لیے چلا گیا۔ جب وہ ایوفیم کے پیالے پر جھک کر پانی ڈال رہا تھا۔ تو جانور وحشت کے مارے پیچھے ہٹ گیا۔ ہُرورجوان اپنی ناگ پھنی کی طرف لوٹ آیا کہ وہ اطمینان سے پانی پی لے۔ وہ کمبل میں لپٹا پڑا تھا۔

ستاروں کی روشنی سیدھی اس کی پیشانی پر پڑ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر وہ اسے مار ڈالتا تو پھر دنیا میں اور کام ہی کون سا اس کے کرنے کو رہ جاتا اور پھر اس رات والی وہی صحرائی خاموشی لوٹ آتی جس کے ہاتھوں اسے اس قدر اذیت پہنچی تھی۔ وہ خوش خوش سکون سے سو گیا۔ اس کے پاؤں بوٹوں میں جمے ہوئے تھے اور پیاسے بھیڑیے ۱۳ کے پانی پینے کی شپ شپ کی سہانی آواز اسے لوری دے رہی تھی۔

سو یہ تھی وجہ کہ بھیڑیا ۱۳ اک خاصی مدت تک شاید سالہا سال زندہ سلامت رہا۔ اور جب آسمان پر چاند پورا ہوتا تو مسلسل اوہانکا کرتا اور بچھڑوں پر حملہ زن ہوتا اور ہُرورجوان طیش کھا کر اس کا پیچھا کیا کرتا۔ لیکن اس آدمی نے بیابان کی وسعت میں اس رات والی صحرائی تنہائی کو پھر کبھی محسوس نہ کیا اور اس کی نظر میں بھیڑیا ۱۳ ایک مقدس، قابلِ احترام دشمن تھا۔

رومولو گائے گوس

صاحبِ کردار

شب کے بارہ بجنے کو تھے کہ مارٹن اپنے دوستوں سے رخصت ہوا۔ اس کی روز کی عادت بن گئی تھی کہ مے خانے میں اس وقت تک ضرور ٹھہرا رہتا تھا۔ شراب پیتا اور مصری سگرٹوں کے کش پہ کش اڑاتا اور اس دوران میں اپنے مختلف النوع اور کثیر التعداد معاشقانہ معرکوں کا تذکرہ چھیڑے رکھتا۔ وہ شیخی بگھارتے ہوئے بڑے فخر سے کہتا۔ عورتیں تو ایں جانب پر لوٹن کبوتر ہو رہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس ڈھب کی زندگی اس کا نصب العین بن چکی تھی۔

دو کرائے کی موٹریں جنھیں کیراکس کی بولی ٹھولی میں 'الو' کے نام سے پکارتے ہیں — گرجے کے سائے تلے کھڑی تھیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے اسے اپنی خدمات پیش کیں۔

"کیا خیال ہے مارٹی، گھر کو نہ چلیے گا؟"

"میں منتظر اور تیار ہوں، مارٹن!"

قصبے کے بے فکرے نے جواب دیا۔ "برخوردارو! آج شب ہمارے لہو کی اک بوند بھی نچوڑ لو تو کمال ہوگا۔"

"ارے کیا بالکل ہی صاف ہو گئے ہو؟ تو پھر کیا ہوا!"

"ارے میاں! پھر دے دنیا، تم جانو —"

"اجی نہیں رہنے دو تم! میں اپنے دو سنڈروں پر رواں دواں ہوتا ہوں۔ یہ رہیں گے بھی بڑے پُر لطف!"

دونوں ڈرائیور اس کی لطیف سی پھبتی پر ہنس پڑے جس میں اس نے "کیراکس" والوں

کی شگفتگی بھر دی تھی۔ ایک نے پیچھے سے آواز دے کر کہا "دیکھیو، کہیں راستہ نہ بھول جانا۔"

"برخوردار، راستہ نہ بھولا ہیں، اگر بھول بھی گیا تو یقین کرو، کھو نہیں جاتا ہیں۔ اپنے سائے سے بھی زیادہ آشنا ہوں راستے سے!"

وہ اپنی ہر دلعزیزی کے زعم میں راستے پر سڑک کو جاتے ہوئے بڑے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا! یہی خیال دل میں سمایا ہوا تھا کہ اب کوئی نہ کوئی ڈرائیور دوسرے سے بولا کہ بولا "بھئی یہ مارٹی! کیا بات ہے بھیا اس کے دل کی! کیا ٹھاٹ کا آدمی ہے واللہ! اپنے تن کا کپڑا بھی اتار کر دے ڈالنے تھیں۔"

احساسِ برتری کی اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے مونچھوں سے بے نیاز لبوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کی ایڑیوں کی میخی تلی کھٹ کھٹ بڑے شاہانہ طور پر پٹریوں پر سنائی دیتے ہوئے۔ آدھی رات کی خاموشی میں گونج رہی تھی۔ اگرچہ وہ کسی ذہنی دقیقہ سنجی کے قابل نہیں تھا مگر اسے سنسان راہوں پر اپنی رفتار کی گونج سننا بڑا پسند تھا۔ اس سے اس کے دل میں اک مبہم سا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے وطن مالوف کی روح پر اپنی شخصیت کا نقش ثبت کر رہا ہے۔ جس کے باسیوں کے مسرور و لطیف کردار، عناد و ظرافت سے بھرپور، اس کے اپنے کردار سے ہمنوا تھے!

یہ خیال مارٹن کے افتخار کی انتہائی مسرت خیز تاسیس تھی۔ وہ سینہ تان کر کہتا تھا۔ "میں اصل اصیل باشندۂ کاراکس ہوں فکر و سنجیدگی کی قبولیت سے عاری مستقل کھلنڈرا۔ عیش و عشرت اور بلند معیارِ زندگی کا دلدادہ۔ دونوں ہاتھوں سے زر و دولت کو لٹانے اور ہر ایک کے دل کو موہنے والا!" اسکا کافی وافی ثبوت اس کی وہ مقبولیت تھی جو اُسے شوفروں، کرائے کی موٹروں کے ڈرائیوروں اور مے خانوں کے مغبچوں میں نصیب تھی!

وہ ان ناموں میں دو اور کا بھی اضافہ کر سکتا تھا۔ جواری اور دلال۔ اگرچہ اپنے وقار پر اک تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے وہ انھیں فراموش کر چکا تھا مگر دل میں ان کا خیال گزرا

ضرور تھا، لیکن وہ خلافِ معمول کی حیاداری — وہ چنگاری جو وقتی طور پر انتہائی تاریک اور فسق و فجور سے معمور زندگیوں کو بھی تابناک کر دیتی ہے اور ان کے خون میں خوابیدہ شاید صدیوں کی روگی شرافت کا آنکھ جھپکنے میں غائب ہو جانے والا ادعا بیدار کر ڈالتی ہے بہرحال وہ خلافِ معمول کی حیاداری ہی تھی جس کے احساس کے ماتحت اسے تائید ذاتی کے طور پر کہنا ہی پڑا۔ "اعلیٰ طبقے میں بھی تو میرے مداح موجود ہیں۔ 'لوئی سا ترے سا آولا'۔ کار اکس کی جان محبوبی۔ اس بات کی تصدیق کر سکتی ہیں۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتی ہیں اور آتا گرے شی آ آرگندی گوئی — اور یہ اور وہ!"

حقیقت یہی ہے کہ وہ تھا بھی محبوب نظر۔ اس کے نفیس قطع کیے ہوئے کپڑے۔ صاف ستھرے خدوخال، منجھے ہوئے اوضاع و اطوار ان لڑکیوں کو موہ لینے کو کافی تھے جو ابھی بہارِ شباب کے دورِ اوّل میں قدم رکھ رہی تھیں۔ جب انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی مرد کی نظرِ التفات کا مرکز ہیں تو وہ بڑے رازدارانہ طور پر دل ہی دل میں محبت کے اولیں جذبات سے حظ اندوز ہو جاتی تھیں۔ جس طرح ان کا شیریں پسند کام و دہن قند نبات کی میٹھی لطافت سے واقفی لطف اندوز ہوتا ہے اسی طرح انھیں یہ چیز بھی قطعی طبعی نظر آتی تھی کہ مارٹن جیسا جامہ زیب اور شاید باز ان کے جمالیاتی ذوق کا روپ دھارے ہوئے ہو۔ وہ مارٹن جو کپڑوں کے متعلق اس قدر محتاط تھا کہ کیا مجال ان میں کوئی شکن پڑے یا بھولے سے بھی داغ نظر آئے۔ جو مصری سگریٹ پیتا تھا اور گلاب کی طرح عطر بیز تھا۔

بہرکیف اس رات مارٹن کار اکس کی شریف اور نوجوان و منفرد شخصیت کے برعکس جمعیت خاطر کو کھویا کھویا نظر آتا تھا کہ اس کے محبوب یار باش آرزو نے تانے، ملاقات کے وعدے کو نبھایا یا نہیں تھا۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ کار میں نو اور دس کے درمیان اسے لینے کے لیے مے خانے پہنچے گا مگر آیا نہیں۔

اک خیال سے نجات حاصل کرنے کی بدترین سے بدترین صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اسے دل میں آنے نہ دیا جائے۔ مارٹن کی بھی آرزو تھی کہ وہ اک ناخوشگوار خیال کو دل میں جگہ نہ دے

مگر خیال تھا کہ اس کے ذہن کے آس پاس کاوے کاٹ رہا تھا، تنگ کر رہا تھا اور بالآخر ہُوا یوں کہ وہ چوری چھپے اس کے نفسِ شعور کی روشنی میں پوری طرح آ گھسا! آرزائے تا نے اس کی ملاقات سے اعراض اس لیے کیا کہ وہ ریتا کے عشق و معاشقے میں مصروف تھا جو اس کے گھر کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

مارٹن اس بات کو حق الیقین سمجھے ہوئے تھا، اک روز یہی بات دل میں بسی ہوئی تھی کہ اس سے آرزائے تا کو آ لیا، جو اس کے مکان کے دریچے تلے اس کی بہن سے مصروفِ گفتگو تھا۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے!

اس سے مہذب انسان کے لیے ظالم بھائی کا کردار ادا کرنا انتہائی مضحکہ انگیز شے تھی مگر قدیم الایام کی دوستی کو نبھلتے جانا بھی اس سے کچھ کم بے طرح نہیں تھا۔

"اُف خدایا! آخر یہ سارا کام میرا ہی تو نہیں ہے۔ بڑے میاں بھی تو ہیں۔ وہ لڑکیوں کے نگران ہیں! اور وہ ذمہ دار۔۔۔۔"

ذمہ دار؟ اس اصطلاح کو وہ استعمال میں لایا ہی کیوں؟ اتفاقیہ ہی سہی مگر تھی بھی کوئی شے جو ذمہ داری کی تقاضہ دار تھی؟ 'آرزائے تا' اک شریف ـــــ ہونہہ م۔ آرزائے تا۔

اک ناقابلِ بیان ذہنی تذبذب کے بعد، سگریٹ کا دھواں اندر کھینچتے اور کندھے جھٹکتے ہوئے گویا اس سخت کوفت سے نجات کی آرزو ہے جو کارلکن روح کردار کے قطعی منافی ہے۔ وہ آرام سے اک نتیجہ پر پہنچ گیا۔ "میں عرض کر رہا ہوں کہ بڑے میاں جو ہیں۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ اس دردسر کو مول لوں۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ـــــ"

ایک اچھے دین زولی کی طرح اس نے فرائض کے تصوّر کو حقوق کے تصور میں خلط ملط کر دیا۔ یا یوں کہہ لیجیے تو بہتر رہے گا کہ اس کے لیے حقوق ہی حقوق تھے فرائض نہیں تھے۔

(۲)

جب گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اتنی رات گئے، سامنے کا دروازہ ابھی تک چوپٹ

ہے! اک فوری اور قطعی نیم شعوری خوف نے پٹڑی پر ہی اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ انتہائی غور سے اندر سے آنے والی آوازوں کو سن رہا تھا۔ آواز تھی کہاں؟ روشن ڈرائنگ روم سے آوازوں کی بھنبھناہٹ تک نہ آ رہی تھی۔ وہاں کوئی ملاقاتی موجود نہیں تھا۔ اس کا دل ڈوب گیا جس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ خیالوں کی عدم موجودگی شدید خلش اضطراب کا باعث تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ سوچنے سے ڈر رہا ہے! آخر ایک خیال آ ہی گیا۔ "کہیں بڑے میاں کو پھر تو غشی کا دورہ نہیں پڑ گیا۔"

اس امکانی بات میں کسی قسم کی تسکین نہیں تھی۔ مگر اس خیال کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہی اسے تسکین سی ہو گئی۔ بالآخر اس نے گھر کے اندر جانے کی ٹھان لی۔

اس کی دو بڑی بہنیں ڈیوڑھی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ گالوں کو ہاتھوں کا سہارا دیئے تھیں اور خالی خالی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ فضا میں نحوست چھائی تھی۔ کوئی چیز جس نے انھیں گھیر رکھا تھا ان جھکے ہوئے سروں کو جھکا رہی تھی۔ ان کے سروں پر زندگی کے غیر مرئی پر کسی حادثے کے منحوس دائروں میں چکر کاٹ رہے تھے!

مارٹن دہلیز پر متذبذب تھا۔ اسے حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ اسے پار کر جائے۔ اک خوف کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اک موت کی سی خنکی تھی جس نے اس کا بند بند ہلا ڈالا تھا۔ اور کسی پنجے کی طرح گلے کو گرفت میں لے رکھا تھا۔

اک بہن اسے یوں ملنے کو آئی، جیسے کچھ بات کہنے کو ہے لیکن اس نے مارٹن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اک ناقابل بیان جذبے کے ساتھ حیوانوں کی طرح تکنا شروع کر دیا۔ مارٹن نے بھرپور کوشش کرنے کے بعد پوچھا "کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

بہن نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا گویا قبر سے بول رہی ہو "کلا یہ تیارات کے کھانے کے بعد باہر کو جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ میں بازار کے اس پار اوزگو کے گھر جا رہی ہوں۔ یہ وقت ہونے کو آیا مگر وہ لوٹی نہیں۔"

"لیکن اُسے بلا کیوں نہ بھیجا تم نے، اب تو آدھی سے بھی زیادہ رات جا چکی۔"

مارٹن نے جواب تو دے دیا مگر اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس نے کہا کیا ہے۔ اس نے فقط اس لیے کہا تھا کہ اس کے دل میں خفیہ طور پر اک خیال اس بات کا آرزومند تھا کہ خدا کرے کہ اس کی بہن اور زکو کے یہاں ہی موجود ہو اور واقعہ یہ ہے کہ وہ دیکھ بھی چکا تھا کہ ان کے سامنے کا مکان بند پڑا تھا۔

اس کی بہن ہچکیاں لیتے ہوئے بولی: "کلاریتا بھاگ گئی ہے مارٹن۔"

مارٹن منجمد کھڑا تھا۔ اس کا منہ نیم وا تھا۔ گویا وہ ناکارہ الفاظ جنھیں وہ کہنے کو تھا اس کے لبوں پر جم گئے ہیں۔ اپنے آپ کو تسکین دہ الفاظ سے فریب دینے کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی۔ جو پیش اندیشگی گھر میں آنے سے پہلے اس پر حملہ زن ہوئی تھی۔ اب اک واقعہ بنی ہوئی تھی۔ اُسے اک احمقانہ سا خیال آیا کہ پوچھے: اسے کون بھگا کر لے گیا ہے؟ مگر اسے بیان کرنے سے پہلے ہی وہ منفعل تھا۔ اس سے بڑھ کر بھلا اور کون جان سکتا تھا کہ اسے کون بھگا کر لے گیا ہے — وہی بدمعاش اُرزاتے تا!

وہ دروازے پر کھڑے کھڑے ذرا گی ذرا گھبرایا سا اور پھر کٹھ پتلی کی طرح اپنے کمرے کو چل پڑا۔ اسے اپنے والدین کے سامنے آتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔ جو کچھ ان سبھوں پر آ ٹوٹا تھا اس سے متعلقہ الزام کے سلسلہ میں اسے اپنے حصّے کی اک مبہم سی آگاہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اس کے باپ نے کہا۔ "تو خیر — باہر کے دروازے میں تالا ڈال دو۔"

برادرانہ شفقت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے! اس کے دل میں کوندے کی لپک کی تیزی اور قوت کے ساتھ باپ کے یہ الفاظ کہ باہر کے دروازے میں تالا ڈال دو اپنی پوری ہولناک اہمیت سمیت گزر گئے! ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ "اب کوئی اُمید باقی نہیں رہی، ہماری ناقابلِ تلافی بے عزتی کی جو انتہا ہونی تھی، ہو چکی!"

اسے اک فوری خیال آیا کہ اپنے والدین کے پاس جا کر ان کی گود میں گر پڑے اور اپنی

مشترکہ بدنصیبی پر ان کے ساتھ آنسو بہائے لیکن کسی مبہم اور پختہ تر خیال نے اسے روک لیا۔ اگرچہ اسے اپنے حصّے کی خطاکاری کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا مگر اس نے یہ سوچنا گوارا نہ کیا کہ وہ کیوں کر متہم ہے۔

وہ چارپائی کے سرے پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک سر سے ٹوپی بھی نہ اتاری تھی یکے بعد دیگرے کئی سگریٹ جلائے اور پھونک ڈالے! اس کا دماغ ایک چکر تھا جو کسی دیوانہ وار قوت سے گھوم رہا تھا۔ کبھی دیوانگی کے بگولوں کو حرکت میں لاکر سخت غیض و غضب کے ساتھ گھومنے لگتا اور کبھی معاً کھڑا ہو جاتا اور یوں معلوم ہوتا کہ اس کی ساری زندگی پوری پوری زبوں حالی و پستی اور قطعی بے اعتنائی کے تحت الثریٰ میں ڈوب گئی ہے ازالہ حیثیت عرفی کی تلافی ہو کر رہے گی، اور بدنامی کا دھبہ خون سے دھل کر رہے گا۔ چاہے وہ خون دغاباز 'آرزو' ہی کا کیوں نہ ہو! وہی 'آرزو' جو یارانِ بزمِ عشرت کی متعدد صحبتوں میں اس کا یار باش رہا ہے!

ایک دفعہ جب دونوں دوست ہو رہے تھے تو بدمعاش نے اپنا نکتۂ نظر واضح الفاظ میں بیان کر دیا تھا۔

"نہ بھیّا! چاہے کوئی گولی سے کیوں نہ اڑا دے۔ شادی نہیں کروں گا۔ زندگی عیش و عشرت کے لیے بنی ہے اور عورتیں زندگی کا ایک حصّہ ہیں۔!"

"کیا سبھی، آرزو نے تا!؟"

"ہاں سبھی سبھی، ایک ایک، اگر میں انھیں کچھ کہوں اور وہ 'ہاں' کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی 'اسی' کی آرزو مند ہیں اور جو وہ نہ قبول کریں تو پھر بھی وہ اتنا ہی اپنے آپ کو میری ممنون محسوس کریں گی!"

حد ہے بے حیائی کی۔ بے غیرتی کی! اسی وقت اس کی ایسی کی تیسی نہ کر دی میں نے! کہ ہم دونوں کو خوب معلوم تھا کہ کس کی بابت پوچھا جا رہا ہے۔ اور جب اس نے جواب دیا تھا "ہاں ہاں! سبھی سبھی، ایک ایک" تو کس کی ذات محلِ نظر تھی! بہن کی اور بیک وقت بھائی کی بے عزتی

پر اسی وقت سے مہر ثبت ہو چکی تھی۔ معاملہ قطعاً عیاں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ یہ معاملہ اس پر اب واضح ہو رہا تھا بلکہ اسے تو پوری قوتِ یقین کے ساتھ کبھی کا پتہ تھا۔ مگر اتنا تردد ہی نہ کیا کہ حفظِ ماتقدم کے تقاضوں کو پورا کرتے! کس قدر بدبخت تھا وہ!

جس طرح تاریک کوئیں سے صاف ستھرا پانی برآمد ہوتا ہے اسی طرح زندگی میں پہلی بار مارٹن نے اپنی حقیر اور پست روح کے لیے روحانی طہارت کی آرزو کو شدت سے محسوس کیا!

مگر یہ آرزو بھی وقتی ثابت ہوئی۔ بآخر اس نے کپڑے بدلے اور سونے کے لیے بستر پر دراز ہو گیا!

(۳)

وہ دوسرے روز دیر سے اٹھا۔ تمام رات بڑے بھیانک خواب آتے رہے اور بہت سے خوابوں کو گزشتہ رات کے واقع کے تاثرات کی حدت و شدت نے جنم دیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے سر کو لون سے تر بہ تر کر کے اک پُر نشاط اثر محسوس کرنے لگا جس سے پراگندگیٔ خیال سے نجات سی ہو گئی۔ اس نے شیو کرنا شروع کر دیا۔ پھر یک قلم اپنی صورتِ حال کا خیال آ گیا۔ جب وہ باہر نہیں جا سکتا تھا تو پھر شیو کیوں؟

یہی تھا وہ وقت جب حقیقی مارٹن، روزمرہ کے مارٹن نے اس بدقسمتی کی وسعت کو پہچانا جس نے اسے اور اس کے باقی کے اہلِ خاندان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا! اب وہ باہر نہیں نکل سکے گا! وہ اتوار والی ذاتی نمائش سے محروم رہے گا۔ قبل از دوپہر، پلازا بولیور میں جلوہ آرائی نہ کر سکے گا۔ بعد از دوپہر گراڈائی زبولیورڈ میں موٹر کی سیر نہ ہو گی، سینما نہ ہو گا، راتوں کو جلسے نہ ہوں گے۔ خدا ہی جانے کب تک دوستوں کی صحبت سے احتراز ہو گا۔ کب تک اپنے آپ کو زندہ درگور کرنا ہو گا۔ کب تک نسیاً منسیا کا عالم رہے گا۔ شاید مدتِ دوام تک! آہ! یہ حادثہ عظیم!

وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہا تھا کہ اس کی ماں آ گئی اور سلسلۂ خیال منقطع ہو گیا۔ بیچاری بدقسمتی کی چکی میں پس رہی تھی۔ بے خوابی اور رونے سے آنکھیں سوج رہی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو اس کے بازوؤں کے حوالے کر دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ پڑی!

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ماں کے سینے کی مقدس گرمی نے اس کے افسردہ دل میں جذبۂ غیرت کو بیدار کر دیا ہے۔ وہ چلّا اٹھا: "میں اس بدمعاش کو مار ڈالوں گا۔"

"نہ بیٹے! خدا کے لیے اس بات کا دل میں وہم بھی نہ لاؤ! خدا نہ کرے کہ تم ایسی حرکت کر بیٹھو!"

"لیکن ماں! یہ بے عزتی! آخر! کیا خیال ہے میں اسے برداشت کر سکتا ہوں؟"

"آہ بیٹے! یوں تو تم ہماری مصیبتوں میں اور بھی اضافے کرو گے! یوں تو تم مجھے مار ہی ڈالو گے۔ مجھے مار کر ہی چین لو گے؟ — نا! نا! ایسی بات کو سوچو بھی نہ تم!"

"اُف خدایا! — ایسی بات کو سوچو بھی نہ تم! اور لوگ پڑے ہنسیں ہم پر! نہ ماں، یہ نہ ہو گا مجھ سے۔ ناممکن ہے جو تم کہہ رہی ہو! یہ میری مردانگی پر ایک حرف ہے! ایک لعنت!"

اِن الفاظ کو بار بار دہرانے سے اسے ان کے معنی پر صداقت ہونے کا یقین ہو گیا۔ اپنے تھوڑے بہت مطالعہ پر انحصار کرتے ہوئے، اس نے خطیبانہ انداز اختیار کر کے کہنا شروع کر دیا۔ "میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ برباد ہو گئی ہے۔" اور ساتھ ہی فرش پر ایک ایکٹر کی طرح ٹہل رہا تھا جو پس پردہ کے نقموں کا منتظر ہو۔ نسلِ انسانی کوئی یکساں رنگ ٹکڑا نہیں ہے۔ اس میں بُرے لوگ بھی ہیں اور بھلے بھی، اسے اک مستحسن خیال سوجھا کہ اپنے آپ ہی کو کیوں نہ گولی سے اڑا دوں!

جب اس نے اس خیال کا اظہار ماں کے سامنے کیا تو وہ چونک اٹھی اور اسے گلے سے لگا کر منت سماجت سے کہنے لگی۔ "مارٹن! خدا کا واسطہ ہے تمھیں، دکھوں کے ماروں کو اور دکھی نہ کرو! جو بیت گئی ہے، اسی نے کمر توڑ رکھی ہے اور مووں کو کیوں، مار رہے ہو! ذرا اپنے

غریب بیمار باپ کا تو خیال کرو! وہ تو سنتے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔"

"ماں! اس کے سوا اور کوئی راہِ فرار بھی نہیں۔ خیال تو کرو آئندہ جینا کس قدر دوبھر ہو جائے گا میرے لیے۔ میں کسی سے آنکھ تک نہیں ملا سکتا! یہاں اب رہا نہیں جا سکے گا!"

"کہیں باہر چلے جاؤ مارٹن۔ کار اس چھوڑ ہی دو!"

"کدھر جاؤں؟ تمھارا مطلب ہے کسی فضول سے گاؤں میں دب کے مر جاؤں؟ اس سے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ گولی کا نشانہ بن جاؤں۔"

"کسی دوسرے ملک کو چلے جاؤ۔ یورپ ہو آؤ۔ کل رات تمھارا باپ اور میں یہی باتیں کر رہے تھے۔ تمھارا یہاں رہنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ وہ تمھاری خاطر قربانی پر آمادہ ہے۔ وہ تمھارے سفر کے اخراجات برداشت کرے گا۔ ہم ہر تنگی ترشی کو سہہ لیں گے۔ میں تمھیں جانتی ہوں اور جانتی ہوں کہ اگر اس نامراد سے تمھاری مڈبھیڑ ہو گئی تو نہ جانے تم کیا کر بیٹھو۔ اب 'نہ' نہ کہو۔ جو کچھ کر رہے ہیں ہم تمھاری بہتری ہی کے لیے کر رہے ہیں۔ میں تمھیں بہت کہوں گی کہ انکار نہ کرنا۔"

سیر اور پھر یورپ کی! اس کا سنہرا خواب پورا ہو رہا تھا۔

جب کبھی کار اس کی زندگی دیوارِ زنداں کی طرح اک بوجھ، اک وبال ثابت ہوتی تھی تو وہ بے اختیار یورپ کے لیے آہیں بھرا کرتا تھا!

کل رات ہی کی تو بات ہے کہ وہ مے خانے میں یارانِ عشرت سے اسی بات کا ذکر چھیڑے ہوئے تھا اور کون جان سکتا تھا کہ چند گھنٹے بعد، انگلی تک ہلائے بغیر یورپ کی سیر اک حقیقت بن جائے گی۔

اس نے سر نہوڑا لیا اور بے بس سا ہو کر بولا "ماں!"

لفظ یوں منہ سے نکلا جیسے اک محزوں، شکست خوردہ کی فریاد ہو۔

"ہاں بیٹے! تمھارے باپ نے کافی سوچ بچار کے بعد اس بات کا فیصلہ کیا ہے۔

فیصلہ کیا تھا پاک مریم کی طرف سے القا تھا۔"

مارٹن نے جیسے اس معاملے کو اچھی طرح سے جانچ تول لیا ہو۔ بآخر کہنے لگا۔ "بہت بہتر ماں! میں چلا جاؤں گا۔"

اور پھر شیو کرنی شروع کر دی!

دو لڑاکا فاختائیں

'چوکی ساکا' میں ننھی بیوہ 'دانا کے تالی نادی شیوز' سب سے بڑھ کر اشتہا انگیز تھی۔ ٹیفی (باشندۂ ویلز) کے سے سنہری بال تھے اور شاہ دانے کا سا سرخ دہن اور آنکھوں سے بڑھ کر دو آنکھیں تھیں جو دو سپاہی تھے کہ وہیں آپ کو اپنی تحویل میں لے لیں گے۔ میں تو کہتا ہی چلا جاؤں گا مگر آپ بھی تو اپنے زورِ تخیل سے کچھ کام لیں۔ اپنی عمر کی ۲۲ ویں بہار میں تھی اور مکانات اور زرخیز زمینیں اس کی دولت۔

جب بھی کھاتے کے جمع خانے میں ایسی ایسی کئی رقمیں موجود ہوں تو اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ یہ کام آپ پر ہی چھوڑتا ہوں کہ کتنا شمار ہوگا ایسے حساب دانوں کا جو میسی ارادے سے سرشار، ان رقوم کا میزان لگانے پر آمادہ ہوں گے اور آرزومند ہوں گے کہ بیوہ بیوگی کا لباس چھوڑ کر عروسی جوڑا پہن لے۔

وہ کون سا آسمان ہوگا جس پر کوئی نہ کوئی بادل کا ٹکڑا موجود نہ ہو۔ اسی طرح حسن بے داغ میں بھی ایک ہلکا سا داغ ہوا کرتا ہے یعنی اس کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی تھی۔ جب چلتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ نرم رو سمندر پر کشتی ہلکورے کھا رہی ہے۔

کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کی شادی کے طلب گار جو ایتک مایوس نہیں ہوئے تھے کہتے تھے کہ یہ لنگ تو دلربا ہے اور اس کے حسن و جمال میں اضافے کا باعث۔ اس کی ذات میں ہزاروں دلربائیاں موجود تھیں جن کے جلووں کو وہ بآسانی بکھیرتی چلی جاتی تھی۔ نامراد عشاق کھٹے انگوروں والی لومڑی کی طرح جواباً کہتے۔

جس لڑکی کے لنگ نہیں ہے
اگر اس سے کبھی کبھار لغزش ہو جائے
اور اس لغزش کو کبھی کبھار کی لغزش نہ کہا جائے
تو آپ خود ہی اس کی لغزشوں کا حساب لگا لیں۔

بہرحال ہماری محبوبۂ دانا کے تالی نا، فیشن کی رانیوں میں سے ایک تھی۔ میں نے اسے فیشن کی واحد رانی اس لیے نہیں کہا کہ اسی شہر میں 'دانا فرانسسکا مرمولی جو' رہتی تھی جو آرڈر آف سنتیاگو کے نائٹ 'دان پیدرو دی اندرید' کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند لی مورز کے نوابوں کے خاندان سے تھا۔

دانا فرانسسکا مختلف انداز کی عورت تھی۔ اس کی رنگت ہمارے نجات دہندہ مسیح کی سی سانولی تھی اور اگرچہ وہ 'دانا کے تالی نا' جتنی نوعمر نہیں تھی۔ مگر خوبصورتی اور لباس کے فیشن میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی کہ ان دونوں کے لباس اور دوسرے ملبوساتی لوازمات پیرس میں نہیں لائما میں تیار ہوتے تھے جو اندنوں فیشن کی دنیا میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتا تھا۔

دانا فرانسسکا پوتوسی کے کان کن کی بیٹی تھی اور شادی کے وقت جہیز میں پچاس ہزار پیسو لائی تھی پھر بھی بعض اس کے باپ کو دوسروں کے مقابلے میں کنجوس کہتے تھے اور وقائع نگار 'مارتی نیز ویلا' کا کہنا ہے کہ جب یہی دوسرے اپنی لڑکیوں کو ایسے ہسپانوی شریف زادوں سے بیاہنا چاہتے تھے۔ جن کے بدن پر چھیتڑا بھی نہ ہوتا تھا مگر ہوتے تھے عالی نسب تو اک لڑکی کو دو دو یا تین تین لاکھ دے ڈالتے تھے۔ کان کنوں کی بڑی آرزو یہی تھی کہ انھیں اپنی لڑکیوں کے لیے ایسے بر ہاتھ آئیں جو آسٹریاز اور گالیسیا کے خطاب یافتہ ہوں اور جن کی شرافت ان کے انتہائی عالی نسب ہونے پر مبنی ہو۔

شیطان کہ جس کا کام ہر پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانا ہے، سمجھ گیا تھا کہ یہ بات 'دانا فرانسسکا' کے کان میں پہنچ گئی ہے کہ اس کا خاوندان لاتعداد کھیتوں میں شامل ہے جو

بیوہ کے شہد کے برتن پر بھنبھناتی ہیں اور کتاب کے کیڑے کی طرح حسد کے کیڑے نے اس کا دل چاٹنا شروع کر دیا۔ چونکہ میں دیانت دار قصہ گو واقع ہوا ہوں اس لیے حقیقت کی خاطر یہ کہے دیتا ہوں کہ اس نے اندریہ کے احتجاج پر ذرا کان نہ دھرا۔

شروع شروع میں تو ان کی رقابت ظاہر بینی تک محدود رہی کہ تعیش میں کون کس سے بڑھا ہوا ہے مگر شہر کی مسلسل افسانہ طرازیوں اور ریشہ دوانیوں نے آخر کار دشمنیوں کا بند پورے طور پر توڑ ڈالا "دانا فرانسسکا" کے گول کمرے میں "کانوجا" کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اگر "دانا کے "نالی نا" کی نشست گاہ میں "پانچا" کا تذکرہ ہو رہا تھا تو ناشائستگی پر کوئی قدغن نہیں تھی۔

یہ تھی صورت حال ۱۶۱۶ کی خیراتی جمعرات کے دن۔

سان فرانسسکو کا گرجا بڑی شان سے سج رہا تھا اور وہاں عبادت گزاری کے لیے چوکی سا کا طبقۂ امرا جمع تھا۔ مصائب مسیح کی تمثیل کا جلوس تھا جس میں دو سین پیش کیے گئے تھے۔ ایک "آخری کھانے" کے متعلق تھا اور دوسرے میں دکھایا گیا تھا کہ یہودی مسیح کو سولی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اس میں یہودی سرخ فام سروں کے ساتھ منہ میں لمبی کی پوتھیاں لیے تھے اور عدالت کے سانولے چہروں والے منظورِ نظر ساتھ ساتھ تھے اور قدرتی طور پر تمثیل میں انہی کا حصہ نمایاں تھا۔

ہماری دونوں ہیروئین جنگلے کے ساتھ جھکی ہوئی تھیں جو تابوت گاہ کے حفاظتی کٹہرے کا کام بھی دے رہا تھا۔ دن کے تین بجے تھے۔ دونوں نے اک دوسرے کو سر سے پیر تک دیکھنا شروع کیا۔ نظریں کھنچے خنجر تھیں۔ پھر کھا نسیوں اور تحقیر آمیز مسکراہٹوں کا پشتہ ٹوٹ پڑا۔ آنکھوں نے زور سے آگے بڑھنا شروع کر دیا اور بہانہ یہ تھا کہ اپنی محافظ عورتوں سے سرگوشیوں میں باتیں کرنی ہیں۔

آخر "دانا فرانسسکا" نے بھرپور حملہ کرنے کی ٹھان لی اور زور سے یوں بولی گویا اپنی محافظہ

سے مخاطب ہے "یہ جو سنہری بالوں والیاں ہیں انھیں اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودیوں کی نسل سے ہیں اور اسی لیے اس قدر فریب کار ہیں۔"

'دانا کے تالی نا' اس حملے کا جواب دیے بغیر کیوں خموش رہتی۔ "اور ان دو غلوں کو بھی اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودیوں کی اس جماعت کی نسل سے ہیں جو مسیح کو سولی کی طرف لے گئی تھی اور اسی لیے ان کا منہ بھی ان کی روح کی طرح سیاہ ہے۔"

"بہتر یہی ہے کہ یہ ہونق پھوہڑ لنگڑی اپنی زبان کو قابو میں رکھے کہ کوئی بھی خاتون اس سے بات کرنے کی خاطر اپنے آپ کو پست کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

توبہ میرے معبود! کیا کہا آپ نے، لنگڑی! اولیاؤں کی پناہ! بیوہ نے سکارف گرا دیا۔ ناخن بے نیام کر دیے اور اپنے مدمقابل پر پل پڑی۔ حریف نے سکون سے حملے کو برداشت کیا اور 'دانا کے تالی نا' کے گرد بازو حمائل کر دیے۔ وہ متوازن نہ رہ سکی اور اوندھے منہ گر پڑی۔ پھر اس نے آناً فاناً اپنا ننھا سلیپر اتارا اپنے مغلوب حریف کے سایا کو اوپر اٹھایا اور عربی سطح مرتفع کے دیدارِ عام کی دعوت دیتے ہوئے چٹاخ پٹاخ سلیپر جڑ دیئے!

"یہ لے سور نی اور یہ اور یہ۔ اب سبق تو مل گیا اپنے سے برتر کے ساتھ گستاخی کرنے کا۔"

یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہوا اور عبادت گزاروں کے مجمع میں اک شور اک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ عورتیں ارد گرد جمع ہو گئیں اور وہ کڑکڑاک تھی کہ مرغیوں کا ڈربہ بھی پناہ مانگے۔ آخر کار دونوں مقابلہ زن حریفوں کے دوستوں نے بڑی مشکل کے ساتھ ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور 'دانا کے تالی نا' کو ایک طرف لے گئے۔

کوئی رویا چلایا نہیں۔ کسی کو غش نہیں آیا، لیکن بے عزتیاں تھیں کہ بس ہونے میں نہ آتی تھیں۔ اس سے تو مجھے یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوکی ساکا کی عورتیں بڑی جگر دار واقع ہوئی ہیں۔

اس اثنا میں مردوں کو وقوعہ کا علم ہو گیا اور گرجے کے باب داخلہ پر وہ اپنی اپنی ہمدردیوں کے لحاظ سے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ سنہری بال والیوں کو ترجیح دینے والوں

کی قطعی اکثریت تھی۔

دانا فرانسسکا کو ان کی جانب سے انتقامی کارروائی کا ڈر تھا۔ رات کے آٹھ بجے تک اسے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار اس کا خاوند چند افسروں کی معیت میں، آرڈر آف مالٹا کے نائیٹ صدر بلدیہ' دان رافے ایل اور تردی سوتومیر' کو لیے آیا کہ بیوی کو ان کی محافظت میں گھر لے جائے۔

ابھی وہ پلازا میئر کے قریب پہنچے ہوں گے کہ دونوں کے ہوا خواہوں میں تلواروں کی جھنکار اور لڑائی کے شور نے صدر کو مجبور کر دیا کہ وہ خاتون کو وہیں چھوڑ کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ قیام امن کی خاطر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو جائے۔

ہر ایک چوک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ دانا فرانسسکا اپنے خاوند کے بازو پر جھکی ہوئی تھی اور سخت مشکل سے چل رہی تھی۔

ہر طرف شور برپا تھا۔ ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک قدیم امریکی پوری رفتار کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا اور جب خاتون کے پاس سے گزرا تو اپنے اس ہاتھ کو بلند کیا جس میں استرا پکڑ رکھا تھا اور شپاشپ اس کے چہرے پر حج کا نشان بنا کر گال اور ناک اور ٹھوڑی کو زخم زخم کر دیا۔ رات کی تاریکی، جم غفیر اور افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ملعون حملہ آور کوفت بھری فضا میں غائب ہو گیا۔

(۲)

حسب توقع قانون نے مجرموں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی مگر یہ توریت کے تودے میں کوڑی کی تلاش کے مترادف تھا۔ چونکہ خیال یہی تھا کہ 'دانا کے تالی نا' اس جرم کے اشتعال کا باعث ہوئی ہے عید الفصح کی سوموار کو سرکاری وکیل اس کے گھر میں وارد ہو گیا۔ وہ ادھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد اور اپنے مقصد کی معذرت خواہی کے ساتھ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے آنا پڑا تھا کہ یہ بھی منجملہ فرائض تھا۔ پوچھنے لگا "کیا آپ کو معلوم ہے خیراتی جمعرات

کی شب کو 'دانا فرانسسکا مرمولی جوکے گھاؤ لگانے والا کون تھا؟"

وہ بلا تامل بولی "جی سرکار جانتی ہوں اور آپ بھی تو جانتے ہیں۔"

"میں بھی جانتا ہوں، کیا معنی؟" سرکاری وکیل 'دان والینن تن تروسی ادز' تاؤ کھا کر مداخلت کرتے ہوئے بولا "آیا آپ اشارۃً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میں بھی اس جرم میں شریک ہوں۔"

'دانا کے تالی نا' نے مسکرا کر کہا "اجی نہیں۔ میں کوئی یہ تھوڑا ہی کہتی ہوں۔"

"چلیے جی ختم کریں یہ قصہ، خاتون کو زخمی کس نے کیا؟"

"ایک استرے نے۔ جسے کسی شخص کے ہاتھ نے چلایا تھا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہی ہے۔"

"تو صاحب! مجھے بھی اتنا کچھ ہی معلوم ہے۔"

قانون کی پہنچ یہیں تک تھی۔ اگرچہ 'دانا کے تالی نا' کی شخصیت مشکوک تھی مگر ثبوت کے بغیر اسے مجرم کیسے ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

بہرکیف حریفوں نے تا عمر اس معاملے کو زندہ رکھا اور مجھے تو یقین ہے کہ انھوں نے اسے اپنے پوتوں پڑپوتوں تک منتقل کر ڈالا تھا۔

لائما کی 'کون کورڈیا' رجمنٹ کا کپتان 'دان جوآکین میریا فے رز' جو بعدہٗ 'ایس پارتے رو' کی قائم مقامی کے دوران سپین کا وزیر امور خارجہ بھی تھا۔ اپنی دلچسپ کتاب مطبوعہ ۱۸۲۱ء میں اس روایت کی سچائی کی تصدیق تو کرتا ہے مگر واقعہ کہیں بیان نہیں کرتا۔ میرا مبنی برحقیقت خیال یہ ہے کہ بعض لوگ زیر نظر مفاد کی نسبت زیادہ اصول کی خاطر قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

'دانا کے تالی نا' اپنے دوستوں اور آس پاس کے گپی ساتھیوں کے سامنے بڑی شیخی سے کہا کرتی تھی "اگر کاغذی پولیس نے ابھی تک ان ضربوں کے نشانوں کو صاف نہیں کر دیا، تو پھر کیا ہوا۔ میرا سایا انھیں ڈھانپ دے گا مگر 'دانا فرانسسکا' اس

بدھا داغ کو کہاں چھپاتی پھرے گی جس نے اس کے چہرے کے حُلیے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔"

اس سارے قصّے سے صاف ظاہر ہے کہ چوکی ساکا کی یہ دو خواتین دو لڑاکا فاختائیں تھیں۔

مکتبہ جدید (چوک انارکلی) لاہور

پبلشرز، بک سیلرز، امپورٹرز، ایکسپورٹرز

بک ڈپو

مکتبۂ جدید کے شوروم (چوک انارکلی، لاہور) میں آپ کے مذاق کی تمام نئی اور اہم کتابوں کا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ آپ نہایت آسانی سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے، اپنے لیے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کتابیں چن سکتے ہیں۔ اپنے احکام کی تعمیل میں آپ اس شعبے کو ہمیشہ مستعد اور باخلوص پائیں گے۔

وی، پی، پی

آپ ڈاک کے ذریعے سے کتابوں کے چھوٹے بڑے آرڈر بھیج سکتے ہیں۔ مکتبۂ جدید سے آپ کی فرمائش پر اردو کی ہر کتاب مہیا ہو سکتی ہے۔ آپ بھروسا رکھیں کہ آپ کے آرڈر کی تعمیل میں تاخیر نہیں کی جائے گی، کتابیں صاف ستھری بھیجی جائیں گی، قیمت درست ہوگی اور کتابوں کی تعداد پوری۔ اگر کوئی شکایت پیدا ہو تو آپ وی، پی، وصول کریں، شکایات خط و کتابت سے رفع ہو سکتی ہیں۔

لائبریریوں کے لیے

مکتبۂ جدید پچھلے بیس سال سے ملک کی بیشتر چھوٹی بڑی لائبریریوں کی تکمیل میں بیش از بیش حصہ لے رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہر سہولت پیش کی جاتی ہے۔ زیادہ رعایت، اچھی کتابیں، مقاماتی مہم رسانی، ماہرانہ مشورہ۔

اُردو کا سب سے اچھا ماہ نامہ

"نصرت"

جیکے از مطبوعات مکتبہ جدید

مدیرِ اعلیٰ : حنیف رامے

"نصرت جس ثابت قدمی سے ترقی کر رہا ہے وہ لائق مبارک باد ہے ۔"

——— قدرت اللہ شہاب

"نصرت میرے لیے مسرت کا پیغام بن کر آتا ہے ۔"

——— مشتاق احمد یوسفی

"اس قوم کو ایک ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے اور نصرت اس فرض کو شاندار طور پر انجام دے رہا ہے۔"

——— سیّد محمد تقی مدیر: روزنامہ "جنگ" کراچی

"نصرت کی پیشکش واقعی قابلِ تحسین ہے ۔"

——— کرنل محمد خان، ڈائرکٹر آرمی ایجوکیشن

"نصرت انسانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لیے آرزو پیدا کرتا اور ملک و ملت کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ حصّہ لیتا ہے ۔"

——— ——— ابوالاثر حفیظ جالندھری

"نصرت کے پیچھے ایک صحت مند پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے ۔"

——— مصور مشرق، عبدالرحمان چغتائی

فی شمارہ : دو روپے ——— سالانہ چندہ: بیس روپے

مکتبۂ جدید (چوک انارکلی)، لاہور